بنائے کربلا



ھل من ناصر ینصرنا

جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان

پوسٹ بکس نمبر ۵۴۲۵ ۔ کراچی

بنائے کربلا

ڈاکٹر سید جعفر شہیدی

جامعہ تعلیمات اسلامی پوسٹ بکس: ۵۴۲۵
کراچی۔ پاکستان

تالیف ـــــــــ ڈاکٹر سیّد جعفر شہیدی
ترجمہ ـــــــــ محمدؐ فضل حق
اصلاح و نظر ـــــــــ کاظم علی گجراتی
کتابت ـــــــــ اشرف راحت
اشاعت دوم ـــــــــ ۱۹۹۲ء
مطبع ـــــــــ الغازی پیکیجز ۔ کراچی

کچھ اپنے بارے میں

حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ سید ابو القاسم موسوی خوئی دام ظلہ العالی کی سرپرستی میں قائم ہونے والا یہ بین الاقوامی ادارہ جامعہ تعلیمات اسلامی دنیا کے متعدد ممالک میں اسلامی علوم و معارف پر مشتمل معتبر اور مستند لٹریچر عوام تک پہنچانے میں کوشاں ہے۔

اس ادارے کا مقصد دورِ حاضر کی روحانی ضروریات کو پورا کرنا، لوگوں کو اصلی اور محکم اسلامی علوم کی طرف متوجہ کرانا اور اس گراں بہا علمی سرمائے کی حفاظت کرنا ہے جو اہلبیتِ رسولؐ نے ایک مقدس امانت کے طور پر ہمارے سپرد کیا ہے۔

یہ ادارہ اب تک انگریزی، اردو، سندھی اور گجراتی زبانوں میں ستر سے زیادہ کتابیں شائع کر چکا ہے جو اپنے مشمولات، اُسلوبِ بیان اور طباعت کی خوبیوں کی بنا پر فردوسِ کتب میں ایک نمایاں مقام حاصل کر چکی ہیں نشر و اشاعت کا یہ سلسلہ انشاء اللہ جاری رہے گا اور بھٹکی ہوئی انسانیت کو صراطِ مستقیم کی شناخت کرواتا رہے گا۔

اس کے علاوہ جامعہ کے زیرِ اہتمام چلنے والے ساٹھ سے زیادہ مدرسے گزشتہ چھ برسوں سے قوم کے بچے بچیوں میں بنیادی اسلامی تعلیم کو عام کرنے میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اِن مدرسوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

دعوتِ اسلام کو فروغ دینا ایک ایسا کام ہے جس کی انجام دہی کے لیے ہم سب کو تعاون کرنا چاہیے۔ ادارہ آپ سب کو اس کارِ خیر میں شرکت کی دعوت دیتا ہے تاکہ دینی تعلیمات کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جا سکے۔

دعا ہے کہ خداوندِ منّان ہم سب پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل کرے۔

تعاون کا طلبگار (شیخ) یوسف علی نفسی نجفی
وکیل حضرت آیۃ اللہ خوئی دام ظلہ العالی (نجف اشرف)

اسلام

کیا تم نے پوری طرح سمجھ لیا ہے کہ اسلام کیا ہے؟ یہ ایک ایسا دین ہے جس کی بُنیاد حق و صداقت پر رکھی گئی ہے۔ یہ علم کا ایک ایسا منبع ہے جس سے عقل و دانش کی متعدّد ندّیاں پھوٹتی ہیں۔ یہ ایک ایسا چراغ ہے جس سے لاتعداد چراغ روشن ہوتے رہیں گے۔ یہ ایک ایسا بلند رہنما مینار ہے جو اللہ کی راہ کو روشن کرتا ہے۔ یہ اُصولوں اور اعتقادات کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو صداقت اور حقیقت کے ہر متلاشی کو اطمینان بخشتا ہے۔

اے لوگو! جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو اپنی برترین خوشنودی کی جانب ایک شاندار راستہ اور اپنی عبودیّت اور عبادت کا بلند ترین معیار قرار دیا ہے۔ اُس نے اِسے اعلیٰ احکام، بلند اُصولوں، محکم دلائل، ناقابلِ تردید تفوّق اور مسلّمہ دانش سے نوازا ہے۔

اب یہ تمھارا کام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِسے جو شان اور عظمت بخشی ہے اُسے قائم رکھو، اس پر خلوصِ دل سے عمل کرو اس کے مُعتقدات سے انصاف کرو، اس کے احکام اور فرامین کی صحیح طور پر تعمیل کرو اور اپنی زندگیوں میں اِسے اس کا مناسب مقام دو۔

امام علی علیہ السلام

مندرجات

گفتارِ مؤلف

زیرِ نظر کتاب کی ترتیب حالیہ چند سالوں میں کی گئی ہے، لیکن ان مطالب کی جمع آوری کوئی آجکل کی بات نہیں ہے۔ یعنی میں کچھ اوپر بیس سال پہلے سے یہ چاہتا تھا کہ حادثۂ کربلا کے بارے میں ایک کتاب لکھوں لیکن اس کام میں کوئی نہ کوئی رکاوٹ پیش آجاتی تھی۔ تاہم یہ خیال میرے دل سے کبھی محو نہیں ہوا، بلکہ ہمیشہ بجلی کے کوندے کی طرح چمکتا اور اسے منور کرتا رہا ہے۔

غرضیکہ یہ کام آج سے کل اور ایک سے دوسرے سال تک ملتوی ہوتا رہا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں نے زیادہ مطالعہ کیا اور ان واقعات پر زیادہ غور کرتا رہا۔ اس طرح میں ہر موقع پر اس حادثے کی جزئیات ذہن میں مرتب کر کے بڑے غور سے جائزہ لیتا تھا کہ اس کی مختلف کڑیاں باہم کس طرح مربوط ہوتی ہیں۔

اس حادثے کے بارے میں جو کچھ میرے ذہن میں محفوظ تھا یا مختلف یادداشتوں میں موجود تھا۔ اس کا خلاصہ چند سال پہلے ماہ محرم کی آمد کے

موقع پر ایک روزنامے میں شائع ہوا۔ اس مقالے کی اشاعت پر میرے بہت سے احباب نے جن خیالات کا اظہار کیا۔ ان کی بدولت میں اس بات پر آمادہ ہوا کہ اس کتاب کو طباعت کے لیے تیار کروں۔ شاید منشائے الٰہی بھی یہی تھی کہ اس سبب سے یہ کتاب ان ایام میں شائقین کے ہاتھوں تک پہنچے۔

جیسا کہ میں نے کہا ہے، کربلا کی تاریخ سے میری دلچسپی کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ مجھے اس کا مطالعہ کرتے ہوئے اب پچاس سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ جہاں تک ممکن ہوا میں نے یہ قصہ مجمل و مفصل اور قدیم و جدید تاریخ، حتیٰ کہ روضہ خوانی اور مقاتل تک کی کتابوں میں پڑھا اور مختلف افراد سے سنا ہے۔ پس اگر میں یہ کہوں کہ واقعہ کربلا پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سے بیشتر میری نظر سے گزر چکی ہیں تو یہ کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ اس حادثے کے اسباب کے بارے میں میرا نظریہ بھی گزشتہ اور بعض موجودہ مؤرخوں جیسا ہی تھا۔ لیکن تاریخ اسلام کے ابتدائی پچاس سالوں کے کچھ واقعات کا مطالعہ اس امر کا موجب بنا کہ میں اس حادثے کی ایک بار پھر تحقیق کروں۔ تاکہ اس کی حقیقی وجہ یا وجوہ کا پتا چل سکے۔ چنانچہ اس تحقیق کے نتیجے میں مجھے معلوم ہوا کہ تاریخ اسلام کے بہت سے واقعات اور بالخصوص جن کا تعلق آغاز نبوت سے بنو عباس کی حکومت قائم ہونے تک کے زمانے سے ہے۔ ان کی صورت وہ نہیں جو گزشتہ مؤرخوں نے سپرد قلم کی اور بعد میں آنے والوں نے اسے قطعی اور درست سمجھ کر قبول کر لیا ہے۔

جس چیز نے مجھے شک میں ڈالا اور حقیقت کی تلاش پر آمادہ کیا، وہ

ان چند بظاہر معمولی سے واقعات کی تحقیق تھی، جو میں اپنی بعض کتابوں اور مقالوں کی ترتیب کے سلسلے میں کر رہا تھا۔ مثلاً حکایت غرانیق، قصہ شہربانو، قتل عمر و عثمان کے اسباب، قتل علیؑ کے لیے خوارج کا منصوبہ، عہد علیؑ میں خوارج کے جرائم، سعد بن عبداللہ بن ابی سرح کا قرآن میں اضافہ کرنا اور ایسی ہی دوسری داستانیں ہیں جو طبری اور دوسرے سادہ لوح مؤرخین نے اپنی کتابوں میں درج کی ہیں۔ بدقسمتی سے ان میں بعض ایسی داستانیں بھی ہیں جن کی دراصل کوئی حقیقت نہیں، لیکن وہ مستشرقین اور دشمنانِ اسلام کے لیے دستاویزی شہادت بن گئی ہیں۔

ان مطالعات کے آخر میں مجھے پتا چلا کہ ان واقعات میں سے بیشتر اس شکل میں رونما نہیں ہوئے جس طرح قدیم مؤرخین نے انہیں پیش کیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے یہ چیزیں لکھی ہیں اور بعد میں آنے والے مؤرخین نے بھی جہاں تک چاہا اور جتنا ہو سکا، ان کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ ایسے تاریخی واقعات بہت کم ہیں جو امویوں اور عباسیوں کی تبلیغات یا مختلف مذاہب کے دینی تعصبات سے متاثر نہ ہوتے ہوں اور ان کی اصلیت میں کوئی تبدیلی نہ کی گئی ہو۔ چنانچہ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ تاریخی حقیقت دریافت کرنے کے لیے ——— خواہ اس کی بنیاد ظن اور احتمال پر ہی کیوں نہ ہو ——— فقط ان سالوں کی تاریخ کا پڑھ لینا کافی نہیں ہے۔ بلکہ تاریخ کو دوسری شرائط کے مطابق بھی پرکھنا چاہیے، جن میں جغرافیائی، اقتصادی اور اجتماعی حالات شامل ہیں۔ نیز آجکل کے تاریخ نویسوں کا اختیار کردہ سائنسی طریقہ بھی یہی ہے۔

گو قدیم مؤرخین نے واقعات کو ضبطِ تحریر میں لانے کے لیے بے حد

کوشش کی ہے اور بعد میں آنے والی نسلوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ لیکن جہاں تک ان واقعات کی تحلیل اور تحقیق کا تعلق ہے، اس میں انھوں نے لازمی شرائط کو ملحوظ نہیں رکھا اور اس بارے میں انہیں معذور سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ یہ ایک ایسا راستہ ہے جو محققین کے لیے گزشتہ اور موجودہ صدی کی علمی کاوشوں کی بدولت کھلا ہے۔ بہر حال جیسا کہ اس کتاب کے متن میں کہا گیا ہے، اگر تاریخ اسلام کا مطالعہ اس تازہ بصیرت سے کیا جائے تو بہت سے اہم واقعات سے پردہ اٹھ سکتا ہے۔

بہر حال میں نے واقعۂ کربلا کی تحلیل کے بارے میں کسی بھی ممکن کوشش سے دریغ نہیں کیا۔ چنانچہ میں نے گزرے ہوتے حالات کو متقابل رکھ کر پرکھا ہے اور ایک ہی طرح کے واقعات کا باہم موازنہ کیا ہے۔

ان مطالب کی تحریر کے وقت ایک دو اہم کتابوں کے سوا کہ جن میں قابل قدر مواد ہے، میں نے اس واقعہ کے قریب العہد مآخذ سے استفادہ کیا ہے۔ کیونکہ ان میں تحریف اور تغییر کا احتمال بہت کم ہے۔ تاہم مطالعے کے دوران جہاں تک ہو سکا زمانۂ مابعد یعنی پانچویں صدی سے عصر حاضر تک کی کتابوں سے بھی رجوع کیا گیا ہے۔ اسی طرح عہد خلفاء کے خاتمے تک کی اسلام کی سیاسی اور معاشرتی حالت کا مطالعہ کرتے ہوتے ان کتابوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا جو اس سلسلے میں بعض مغربی مؤرخین نے لکھی ہیں۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے کہ واقعۂ کربلا کے قدیم ترین تحریری اسناد اس کے وقوع میں آنے سے تقریباً دو صدی بعد کے مؤلفات ہیں۔ تاہم ان مآخذ پر انحصار کرنے کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ بس دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بارے میں ہمیں ہر قسم کی خطا کے ارتکاب سے محفوظ رکھے۔ آمین!

سید جعفر شہیدی

واقعۂ کربلا کی تاریخی اہمیت

الَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَہٗ ط

وہ بات کو جی لگا کر سنتے ہیں اور پھر اس میں سے اچھی بات پر عمل کرتے ہیں۔ (الزمر۔ آیت ۱۸)

جس واقعہ کے بارے میں از سرِ نو جستجو کرنے کے لیے میں نے قدم اٹھایا ہے، وہ کوئی آج کی بات نہیں ہے۔ وہ تمام لوگ جو تاریخِ اسلام سے واقفیت رکھتے ہیں ـــــ مسلم ہوں یا غیر مسلم ـــــ اس حادثے کے حالات سے آگاہ ہیں۔ وہ کچھ اوپر ہزار سال سے اس کے بارے میں بحث کر رہے ہیں۔ انہوں نے اس کے متعلق کتابیں لکھیں، اشعار کہے، مرثیے مرتب کیے اور مجالس برپا کی ہیں۔

تیرہ سو سال سے کچھ زائد عرصے میں لاکھوں، کروڑوں انسان اس حادثے کی یاد تازہ رکھنے کے لیے جمع ہوئے اور انہوں نے آنسو بہائے ہیں۔ ہزاروں اشخاص اس یادگار کی حفاظت کی خاطر قتل ہوئے یا انہوں نے

اوروں کو قتل کیا ہے۔ ان تیرہ صدیوں میں سیکڑوں سنیوں اور شیعوں، نیز دسیوں عیسائیوں اور دوسرے مذاہب کے لوگوں نے اپنے اپنے نظریے سے اس کا تجزیہ اور تحلیل کی ہے۔ انہوں نے اپنی دانست یا اپنی پسند کے مطابق اس واقعہ کے ہیرو کو بیشتر سراہا ہے اور اس پر بہت کم حرف گیری کی ہے۔ انہوں نے اس کی جدوجہد اور اس کے قتل کو عدالت خواہی، سرفروشی، دلاوری یا جاہ طلبی کا نام دیا ہے۔ وہ اپنی جستجو اور اظہار میں آزاد رہے ہیں اور اب بھی آزاد ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان مؤلفین میں سے بہت سے ایسے ہیں جنہوں نے راہِ راست تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر ان میں سے ایک گروہ نے اپنے آپ کو اس حادثے کے آئینے میں دیکھا اور پھر اسے اپنی آرزوؤں اور خیالات کا ایک مرقع بنا کر پیش کر دیا ہے۔

اب رہ گئی میری بات! میں خوش اعتقاد شیعوں کی طرح یہ نہیں کہنا چاہتا کہ کربلا کے ہیرو نے اپنے آپ کو اس لیے قتل ہونے کے لیے پیش کر دیا تاکہ وہ خدائے تعالیٰ سے گناہگار شیعوں کی شفاعت کرے۔ اس طرح میں اسے وہ مقام نہیں دوں گا جو کفارہ کے عقیدے کے مطابق عیسائیوں کی نظر میں حضرت عیسیٰؑ کا ہے۔ نہ انیسویں صدی کے یورپی مؤرخوں کے شیفتہ بعض اہل مشرق کی طرح اسے شاکی، مہم جو اور دمشق کی قومی عربی حکومت کا باغی قرار دیتا ہوں۔ نہ آجکل کے بعض غیر مطمئن لوگوں کی طرح اس کے کردار کو اپنے افکار اور نظریات کے لیے بطور دلیل پیش کرتا ہوں، تاکہ ایک آزادی خواہ کی حیثیت سے آمرانہ حکومت کی مخالفت کرنے اور اشتمالی نظام کو اپنانے کا جواز پیدا کر سکوں۔

ان لوگوں میں سے ہر ایک اس حادثے کی توجیہہ اس طرح کرتا ہے

جیسی وہ چاہتا ہے نہ کہ جس طرح یہ رونما ہوا ہے۔ بلا شبہ تاریخ کی تحلیل میں ایسی روش اختیار کرنے سے جس چیز کی بہت کم نشاندہی ہوتی ہے وہ اصلی اور خارجی حقیقت ہے۔ اسی طرح ان یادداشتوں کو لکھنے میں میرا مقصد مقتل نویسی، مذہبی تبلیغ حتیٰ کہ تاریخ لکھنا بھی نہیں ہے۔ بلکہ اسناد واقعہ کو جمع کرنے اور ان کی درجہ بندی کے دوران میں نے خود یہ سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ جو کچھ ہوا وہ کیوں ہوا؟ نیز یہ سعی بھی کی ہے کہ اس سوال کا جواب خود حوادث کے اندر سے دیا جائے اور پھر اس جواب کو ـــــ جس کے دریافت ہونے کی مجھے امید ہے ـــــ فیصلے کے لیے قارئین کے سامنے پیش کیا جائے۔ اس سوال کا جواب تلاش کرنا فقط حادثے کی خاطر ہی نہیں ہے کیونکہ وہ تو رونما ہو چکا ہے اور اسے رونما ہوئے صدیاں گزر گئی ہیں لیکن جب ہم غور سے دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ حادثہ ایک ایسی تاریخ کا جزو ہے جس کے واقعات میں سے ہر واقعہ کسی پہلے واقعے کا نتیجہ ہے۔ یہ ایک عظیم تمدن کی تاریخ ہے کہ جس کی رفتار زمان و مکان کے مختلف حالات میں سستی یا تیزی اور کمی یا بیشی سے دوچار رہی ہے لیکن کبھی رکی نہیں۔ حتیٰ کہ اس زمانے میں بھی اس کی پیشرفت اگر ایک پہلو سے سست ہو گئی ہے تو دوسرے پہلوؤں میں اس کی حدود زیادہ مضبوط اور وسیع ہو گئی ہیں۔

مذکورہ سوال کا درست جواب حاصل کرنے کے لیے میں نے اپنے ذاتی معتقدات کو نظر انداز کر دیا ہے۔ نیز میں نے ایک صدی سے زیادہ عرصے کی ان روایات اور داستانوں کو بھی مسترد کر دیا ہے، جو ایک دوسری کی مخالف ہیں۔ تاہم میں نے ان میں سے فقط وہ باتیں لکھی ہیں کہ اصلی تاریخ کے علاوہ مملکتی، دینی، اقتصادی اور اجتماعی حالات بھی ان کی

تائید کرتے ہیں۔ میں نے اس کتاب میں حادثۂ کربلا کو ایک ایسے زاویے سے دیکھا ہے، جس کی جانب ماضی میں بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ اگر میں اپنی اس کوشش میں کامیاب رہا ہوں تو مجھے یقین ہے کہ جو کچھ میں نے اخذ کیا ہے وہ حال اور مستقبل کے لیے کارآمد ثابت ہوگا۔ اس لیے کہ گو اس حادثے کا ہیرو مارا گیا ہے، لیکن جس مقصد کی خاطر اس نے قیام کیا وہ زندہ ہے۔ نیز جن لوگوں نے اس مقصد کے حصول کی خاطر اس سے نصرت کا وعدہ کیا، پھر اپنا یہ وعدہ وفا کیا یا نہ کیا، تاریخ کے دامن میں ایسے افراد بہت ہوئے ہیں اور رہیں گے۔

عہد معاویہ میں اصول اسلام کی تبدیلی

اَلَّذِیْنَ طَغَوْا فِی الْبِلَادِ ۝ فَاَکْثَرُوْا فِیْہَا الْفَسَادَ

وہ جنہوں نے شہروں میں سرکشی کی اور ان میں بہت فساد پھیلایا۔ (الفجر۔ آیات ۱۱-۱۲)

اگر کوئی شخص تاریخِ اسلام کے فقط پہلے تیس سالوں کے واقعات کی تفتیش کر کے اس حادثے کا تجزیہ کرنا چاہے، جو ۶۱ھ میں رونما ہوا تو ممکن ہے وہ اس نتیجے پر پہنچے:

عثمان بن عفان کی خلافت کے دوسرے نصف سے لے کر معاویہ بن ابو سفیان کی وفات تک حکومت اسلامی کے اصول یا بعض اصول بتدریج تبدیل ہو گئے اور اسلام کی اصطلاح کے مطابق دین میں بدعتیں پیدا ہو گئیں۔ معاویہ کے زمانے میں یہ تبدیلی اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی اور علاوہ دوسری چیزوں کے 'عدل'، کہ جو اس دین کا اصلی ستون ہے، وہ تقریباً ختم ہو گیا تھا۔

چنانچہ کسی شرعی جواز کے بغیر یا کسی کمزور جواز کے بل بوتے پر کسی خاص مذہب کا پیرو ہونے یا کوئی مخصوص طرزِ فکر رکھنے کی بنا پر ایذا رسانی، مال کی ضبطی، قتل اور جلا وطنی روزمرہ کا معمول بن گیا۔ ان بدعتوں کے رواج پانے سے کئی ایک نامطمئن لوگ پیدا ہو گئے اور ان کی تعداد میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوا اور اس زمانے کا عرب معاشرہ شورش برپا کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ تاہم معاویہ کی زندگی میں ایک بہت بڑی رکاوٹ موجود تھی، جس کے سامنے نامطمئن لوگوں کو یہ ہمت نہ پڑی کہ وہ معاویہ یا اس کے عاملوں سے ٹکر لے سکیں۔ یہ رکاوٹ شام کی مرکزی قوت تھی جو ایک طرف فرمانروا کی چابکدستی اور مہارت کے زیرِ سایہ اور دوسری طرف اس کے گورنروں اور دوسرے ظاہرا اور خفیہ کارگزاروں کی ہوشیاری اور پوری لگن سے کام کرنے کی بدولت پروان چڑھی تھی۔ ملک کے حالات پر حکومت کی اس مضبوط گرفت نے ہر مخالف اجتماع کو درہم برہم کر دیا اور ہر سازش کی بر موقع سرکوبی کر دی۔

معاویہ کی موت اور یزید کے برسرِ اقتدار آنے کے نتیجے میں نامطمئن لوگوں کے لیے راستہ کھل گیا۔ یزید نہ صرف یہ کہ خلافت کے منصب کے لیے ضروری شرائط پوری نہیں کرتا تھا، بلکہ اس نے مسلمانوں کے معمول کے خلاف حکومت حاصل کی تھی۔ چنانچہ دل برداشتہ لوگوں کو موقع ملا کہ وہ مل جل کر یزید کی حکومت کا تختہ الٹ دیں اور خلافت کو اس کے پہلے راستے یعنی اجماعِ امت یا عوام کی آراء سے سربراہ کے انتخاب کے طریقے پر لوٹا دیں اور جہاں تک ہو سکے بدعتوں کا قلع قمع کر دیں۔ بظاہر ان مخالفوں اور ناراض لوگوں کا ہدف یہی تھا۔

لیکن دوسری طرف دمشق کی نئی حکومت جو مسلمانوں کے مروجہ طریقے

کے خلاف موروثی قوت کی بنیاد پر قائم ہوئی تھی۔ وہ یہ چاہتی تھی کہ جس قدر جلد ہو سکے اپنے نئے اقتدار کی بنیادوں کو مضبوط کرے۔ چنانچہ اس سلسلے میں فطری طور پر اس کا پہلا اقدام یہ تھا کہ حجاز اور عراق کے اسلامی صوبوں کو دمشق کا مطیع بنائے اور ان صوبوں کے ان لوگوں سے بیعت لے کر انہیں اپنا فرمانبردار بنائے جن کے خلافت کے لیے نامزد کیے جانے کا احتمال تھا۔

حجاز خاص طور پر روحانی اہمیت رکھتا تھا اور مسلمانوں کی نظروں میں وہاں کے رہنے والوں کی خاص قدر و منزلت تھی۔ اسلام کا ظہور شہر مکہ میں ہوا، مسلمانوں کا قبلہ کہ جہاں وہ ہر سال حج کو جاتے تھے، وہ اسی شہر میں واقع تھا۔ دوسرا اہم مرکز مدینہ تھا، جو رسول اکرم ؐ اور ان کے خلفاء کی جائے قیام رہ چکا تھا۔ چنانچہ ۳۵ سال تک اسلامی حکومت کے تمام کام اسی شہر میں انجام پاتے رہے تھے۔ آنحضرت ؐ کا مقبرہ اور آپ کی مسجد کہ جن کی مسلمانوں کی نظروں میں بے حد قدر و منزلت تھی، وہ بھی اسی شہر میں تھے۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ دمشق کے سیاستدان ان شہروں کی اہمیت اور حیثیت سے بخوبی واقف تھے۔ تاہم انہیں اطمینان تھا کہ مکہ کی جانب سے انہیں کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔ کیونکہ نئے فرمانروا کے اعزہ و اقربا (بنی امیہ) کی بہت بڑی تعداد اس شہر میں رہتی تھی۔ اس قبیلے کی بہت سے دوسرے قبیلوں سے رشتہ داری بھی تھی۔ جبکہ یہ چیز قبائلی رسم و رواج کے خلاف تھی کہ غیروں کو اپنوں پر ترجیح دی جائے۔

مدینہ کے لوگوں کی طرف سے بھی انہیں کوئی خاص پریشانی نہیں تھی۔ کیونکہ سالہا سال پہلے ابوسفیان اور اس کے آباؤ اجداد کی اولاد کے لوگ اور ان کے بہی خواہ اس شہر میں آ گئے تھے، جو کسی طور بھی بنی ہاشم یا کسی دوسرے

خاندان کی خاطر بنی امیہ کا ساتھ چھوڑنے کو تیار نہ تھے۔ خلیفہ عمر کے زخمی ہونے اور چھ رکنی شوریٰ کی تشکیل کے بعد امویوں نے امام علی علیہ السلام کو خلافت ملنے کی راہ میں جس طرح روڑے اٹکائے اور جس انداز میں خلافت کے لیے عثمان کا انتخاب عمل میں آیا' وہ مدینہ میں اس گروہ کی قوت کا ایک زندہ ثبوت ہے۔

اندریں حالات عراق ہی وہ واحد صوبہ رہ جاتا ہے جس کی طرف سے نئی حکومت کو خطرہ تھا اور جس واحد ہستی کے خلافت کے لیے نامزد ہونے کا اسے خوف تھا' وہ حسینؑ ابن علیؑ تھے۔

عراق میں کئی سال پہلے سے بنی امیہ کے پلڑے کا کوئی وزن باقی نہ رہا تھا' جیسا کہ ہم آئندہ ابواب میں دیکھیں گے کہ مضری یمانی[1] کا توازن بگڑ چکا تھا اور ظہور اسلام سے پہلے اور بعد عربوں کی بیشتر آویزشیں اسی عدم توازن کا نتیجہ تھیں۔ اسی وجہ سے اہل عراق نے اپنی امیدیں بنی ہاشم سے وابستہ کر رکھی تھیں اور بنی امیہ سے ناخوش تھے۔

خلافت عثمان میں آخری سالوں کے ہنگامے کہ جن کے نتیجے میں وہ قتل ہوئے' امام علیؑ کی خلافت میں بصرہ اور کوفہ کے دو شہروں کا ایک دوسرے کے مقابلے پر کھڑے ہونا' پھر وہ جنگ کہ جس نے یزید کے باپ معاویہ کو شکست کے کنارے تک پہنچا دیا۔ نیز پارسا مسلمانوں کے ایک بہت بڑے گروہ (خوارج) کا امت اسلامیہ سے جدا ہونا اور قتل و غارت کا بازار گرم کرنا۔ ان

---

[1] مضری عدنانی عرب تھے جو حجاز میں بودوباش رکھتے تھے اور یمانی قحطانی عرب تھے۔ جو جنوب میں رہتے تھے۔ اس بارے میں کتاب کا صفحہ ۹۷ تا ۱۰۸ ملاحظہ کریں۔

سب حادثوں کی بنیاد عراق ہی میں پڑی۔ چنانچہ یزید کو اپنے باپ کی یہ نصیحت یاد تھی کہ: اگر عراقی تمہیں کہیں کہ ہر روز ایک حاکم کو ہٹا دو اور دوسرے کو اس کی جگہ تعینات کر دو تو ان کا کہنا مان لینا۔ کیونکہ ایک لاکھ تلواروں کا سامنا کرنے کے مقابلے میں ایک حاکم کا تبدیل کرنا زیادہ آسان ہے۔[1]

جب یزید نے بادشاہت سنبھالی تو صحابہ کی اولاد میں سے تین ایسے اشخاص مدینہ میں مقیم تھے، جو لوگوں کی نگاہوں میں عظیم المرتبت تھے اور اسلامی معاشرہ ان کی بڑی قدر کرتا تھا۔ یہ تین اشخاص حسینؑ ابن علیؑ۔ عبداللہ ابن زبیر اور عبداللہ ابن عمر تھے۔ یہ امر مسلم تھا کہ ابن زبیر اور ابن عمر اس رتبے کے حامل نہیں تھے جو حسینؑ ابن علیؑ کو حاصل تھا۔ ان کے والد ماجد امام علیؑ سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں اور رسول اکرمؐ کے داماد تھے۔ نیز انہوں نے کئی سال عراق میں مسلمانوں کے خلیفہ کی حیثیت سے بھی گزارے تھے۔ اس کے علاوہ معاویہ کے زمانے میں امام حسین علیہ السلام کے لوگوں سے برتاؤ، ان کی بزرگواری، عالی ظرفی، کشادہ دلی اور آزادگی نے عراقیوں کو ان کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ اگر عراقی انہیں اپنے پاس بلاتے اور وہ حکومت وقت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے تو دمشق کو ایک بہت بڑے المیے سے دوچار ہونا پڑ جاتا۔

بنا بریں یزید اور اس کے مصاحب یہ ضروری سمجھتے تھے کہ جس طرح بھی ممکن ہو امام حسین علیہ السلام کو اپنا مطیع بنا لینا یا ان کا کام تمام کر دینا چاہیے، تاکہ عراقی ایک بار پھر اپنے مقام پر خاموش بیٹھ جائیں

---

[1] طبری جلد ۷ صفحہ ۱۹۷

اور اب دوبارہ ایسی جنگ نہ ہو، جیسی صفین میں ہوئی تھی۔

یزید نے اپنی خلافت کے ابتدائی ایام میں حاکم مدینہ کو جو تاکیدی خط لکھا[1] وہ اسی خطرے کے احساس کا نتیجہ تھا۔ اگر یزید تحریک شروع ہونے اور عراقیوں کے ان سے رابطہ قائم کرنے سے پہلے کامیاب ہو جاتا تو ابن زبیر، ابن عمر اور ان دوسروں کا معاملہ بھی ختم ہو جاتا جو خلافت پر نظریں جمائے ہوئے تھے، اس طرح یہ انقلاب پروان چڑھنے سے پہلے ہی دم توڑ دیتا، یہی وجہ تھی کہ یزید نے سب سے زیادہ دباؤ حسینؑ پر ڈالا۔ تاہم حکومت دمشق کی یہ توقع پوری نہ ہوئی اور حسینؑ نے نہ تو مدینہ میں بیعت کی اور نہ ہی مکہ میں قتل ہوئے۔ وہ مدینہ سے مکہ اور وہاں سے عراق گئے تاکہ اس کام کی تکمیل کریں جو ان کے والد اور بھائی نے شروع کیا تھا اور نا تمام رہ گیا تھا۔

جب حکومتِ دمشق نے سازش کا راستہ اختیار کرنے میں شکست کھائی اور اس کے لیے خطرہ بڑھ گیا تو اس نے فوجی طاقت سے کام لینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ایک چالاک اور سخت دل شخص کو حاکم بنا کر عراق بھیجا۔ اس نے پہلے تو امام حسینؑ کے نمائندے مسلم بن عقیل کو جو ان دنوں کوفہ میں تھے، ان کے چند حمایتیوں سمیت قتل کر دیا اور لوگوں کو اپنے سخت اقدامات سے مرعوب کیا۔ بعدازاں امام حسین علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کا کام تمام کر دیا۔ اس حادثے کے اسباب کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کا خلاصہ یہی ہے۔

پہلی نظر میں یہ تحلیل اور تجزیہ بے حد فطری اور منطقی نظر آتا ہے اور شاید بعض محققین کو مطمئن کر دیتا ہے لیکن یہاں بھی بعض ایسے سوال پیدا ہوتے ہیں جن کا جواب کتابوں میں نہیں ہے۔

---

[1] حسینؑ جب تک بیعت نہ کریں انہیں مت چھوڑو (طبری حوادث سال شصتم)

واقعۂ کربلا کے وقت مسلمانوں کا سکوت

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ط

اور جس جان کو مارنا خدا نے حرام کر دیا ہے اس کو قتل نہ کرو مگر جائز طور پر۔ (بنی اسرائیل۔ آیت ۳۲)

جو شخص حادثۂ کربلا کے واقعات کو غور سے پڑھتا اور دیکھتا ہے کہ کس طرح پیغمبر اسلامؐ کے خاندان کا مجموعی طور پر قتل عام کیا گیا تو اسے پتا چلتا ہے کہ کوفہ کے لوگ جو بظاہر مسلمان تھے، انہوں نے اپنے پیغمبرؐ کے فرزند اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ وہی کیا جو وہ کافروں کے ساتھ کرتے تھے۔[1] اگر مطالعہ کرنے والا وہ شخص اسلام کے معاشرتی اور تعزیری احکام سے واقف ہو تو اس کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ: اگر یزید نے اپنی حکومت کو محفوظ

---

[1] یعنی بالغ مردوں کو قتل کر دیتے اور عورتوں کو قیدی بنا لیتے تھے۔

رکھنے کے لیے اسلام کے مسلمہ اصولوں کو نظر انداز کر دیا۔ اگر یزید کے شام، حجاز اور عراق میں متعین عامل اس کے پورے پورے فرمانبردار تھے اور مسلمان ہونے اور دین اسلام کے احکام کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ اگر کوفہ کے حاکم کی کوشش اس بات پر منحصر تھی کہ شاہ دمشق کو راضی رکھے تاکہ وہ خود کچھ زیادہ عرصے تک اپنے عہدے پر قائم رہے یا اس سے جواب نہ طلب کیا جائے۔ اگر شام، حجاز اور عراق کے تینوں صوبوں کے سپاہی حکومت کے اس قدر وفادار تھے کہ انہوں نے اس کی خاطر اپنا دین قربان کر دیا —— وہ دین کہ ان کے پاس جو کچھ تھا اسی دین کی بدولت تھا۔ وہ دین جس نے انہیں پستی سے اٹھا کر بلندی پر پہنچا دیا تھا۔ تب بھی اس وقت کے عام مسلمانوں نے اس حادثے کے بارے میں اس قدر بے پروائی اور بے اعتنائی کیوں دکھائی؟ ان وسیع اور گنجان آبادی کے علاقوں کے لوگ محض اس منظر کے تماشائی بنکر کیوں رہ گئے؟ کیا بات تھی کہ صرف نصف صدی گزرنے سے وہ فقہ اسلام اور احکام دین سے اتنے لاعلم تھے کہ وہ یہ بھی نہ سمجھ سکے کہ کیونکر وہ دینی ذمہ داری سے انکار کے مرتکب ہو رہے ہیں اور اس کے نتیجے میں کس ذلت سے دوچار ہوں گے۔ جبکہ نص قرآن کے مطابق قتل ناحق حرام ہے۔[1] پھر امام حسینؑ کا خون ناحق ان کی نظروں میں کیوں غیر اہم چیز ہو کر رہ گیا؟ ابھی آخری حج کے اس مشہور اجتماع کو نصف صدی سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا، جس میں سارے حجاز کے بہت سے لوگ حاضر تھے۔ اس اجتماع میں رسول اکرمؐ نے لوگوں سے فرمایا تھا: "میری بات سنو! کیونکہ مجھے یہ علم نہیں کہ آئندہ سال

---

[1] سورۂ انعام۔ آیت ۱۵۱

میں تمہیں دیکھوں گا یا نہیں دیکھوں گا۔

اے لوگو! تمہارا خون اور مال ایک دوسرے کے لیے اس دن تک حرام ہے، جب تم اپنے پروردگار سے ملاقات کرو گے"۔[1]

بلاشبہ سنہ ۶۱ھ میں کوفہ — بصرہ — مدینہ — مکہ اور دمشق میں موجود ایسے اشخاص کی تعداد کم نہ تھی، جو اس اجتماع میں موجود تھے اور جنہوں نے رسول اکرمؐ کے ارشادات اپنے کانوں سے سنے تھے۔ امام حسین علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں نے کونسا ایسا جرم کیا تھا، جس کی سزا فقہ، اسلامی کے مطابق قتل تھی؟ اگر ان کا کوئی جرم نہ تھا تو مسلمان کیوں ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر بیٹھے رہے تاکہ کوفہ کے سپاہی انہیں قتل کر دیں؟ ابھی کوفہ میں رسول اکرمؐ کے صحابہ بڑی تعداد میں موجود تھے۔[2] یہ لوگ تابعین[3] کے ایک بڑے گروہ اور روسائے شہر کے ساتھ مل کر حاکم کوفہ کو مجبور کر سکتے تھے کہ جو راستہ اس نے اختیار کیا، اس سے ہٹ کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کرے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا! آخر کیوں؟

---

[1] طبری، حوادث سال دہم، یعقوبی (مطبوعہ نجف) جلد ۱ صفحہ ۱۹۰۔ ابن ہشام جلد ۴ صفحہ ۲۷۵

[2] طبقات ابن سعد جلد ۶ صفحہ ۴۳

[3] تابعین صحابہ کے بعد کے طبقے کو کہتے ہیں۔ وہ مسلمان جنہوں نے رسول اکرمؐ کی زیارت کی اور ان کی خدمت میں حاضر ہوئے صحابہ کہلاتے ہیں اور وہ مسلمان جنہوں نے اصحاب رسولؐ کو دیکھا اور خود آنحضرتؐ کی زیارت نہیں کی انہیں تابعین کا لقب دیا گیا ہے۔

کوفہ پانچ سال تک امام علی علیہ السلام کی خلافت کا مرکز رہا تھا۔ وہاں کے لوگوں نے جمل ــــ صفین اور نہروان کی لڑائیوں میں انہی امام حسین علیہ السلام کے والد کا ساتھ دیا اور ان کے ساتھ ہو کر مخالفین کو قتل کیا اور خود بھی قتل ہوئے لیکن وہ لوگ کربلا ایسے عظیم حادثے کے وقت یوں خاموش ہو گئے کہ گویا موت ان کے سروں پر منڈلا رہی تھی، اسکی وجہ؟

سنہ ۶۱ھ میں کوفہ کے علاوہ شام میں بھی کئی ایک صحابہ رسولؐ زندہ و موجود تھے۔ ان میں سے بعض یزید کی نظر میں بڑا بلند مقام رکھتے تھے۔ پھر مسلمانوں کے اس مرکز میں اس المیے کے خلاف کوئی اقدام کیوں نہیں ہوا تھا؟

دو دوسرے بڑے شہر یعنی مکہ اور مدینہ کہ جو دمشق اور کوفہ کے بعد مسلمانوں کی سیاسی حکمت عملی متعین کرنے میں با اثر تھے، انہوں نے بھی کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا۔ یہ درست ہے کہ اس زمانے میں ذرائع ابلاغ ایسے نہ تھے کہ لوگوں کو رونما ہونے والے حادثات کے بارے میں فوری طور پر اطلاع مل جاتی لیکن ان بڑے صوبوں کے وہ لوگ جو سیاست سے تعلق رکھتے تھے، وہ تو چند ماہ پہلے سے ہی سمجھ گئے تھے کہ اس کشمکش کا انجام کیا ہو گا۔ امام حسین علیہ السلام کی عراق روانگی سے پہلے اور عراق کے راستے میں بھی کئی اشخاص آپ سے ملے اور انہوں نے ان کو آنے والے خطرے سے باخبر کیا۔ لیکن جو کچھ انہوں نے کہا اس کے ساتھ کوئی عملی اقدام شامل نہ تھا اور اس کی حیثیت ہمدردانہ مشورے سے زیادہ نہ تھی۔ کہا جا سکتا ہے کہ ان لوگوں نے جو کچھ دیکھا یہ اس کے بارے میں ایک قسم کی رپورٹ تھی۔ جو لوگ حجاز میں مقیم تھے وہ دیکھ رہے تھے کہ شام اور حاکم کوفہ کتنی تیزی سے اپنی فوجوں کو حرکت میں لے آئے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ ایک خونیں معرکہ درپیش ہے۔

لیکن اس گروہ کا جو ردعمل ہم تاریخ میں دیکھتے ہیں وہ "خدا کی پناہ" اور خدانخواستہ کی حدود سے آگے نہیں بڑھتا۔ نہ صرف یہ کہ انھوں نے اس جنگ کو روکنے کے لیے کوئی اقدام نہیں کیا بلکہ اپنے پیغمبرؐ کے نواسے کے شہید ہو جانے سے مہینوں اور سالوں بعد تک ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہے اور یزید کی موت تک خاموشی اختیار کیے رکھی۔ وہ سب سے بڑا ردِعمل جو اس حادثے کے بعد اس صوبے میں دیکھا گیا وہ محض اس پر افسوس کرنا اور بعض اوقات گریہ و ماتم کرنا ہی تھا۔

مدینہ کے لوگوں کا خروج کہ جو ۶۳ھ میں حرہ[1] کی جنگ پر ختم ہوا، اس کی وجہ نواسۂ رسولؐ کی شہادت سے زیادہ ان لوگوں کی یزید کے ذاتی کردار سے بیزاری تھی۔ چنانچہ جب مدینہ کے نمائندے شام سے واپس آئے اور انھوں نے کہا کہ ہم ایک فاسق شخص کے پاس سے آ رہے ہیں جو ہرگز خلافت کے لائق نہیں ہے۔ اس وقت مدینہ کے لوگوں کو خیال آیا کہ یزید کی حکومت کا تختہ الٹ دینا چاہیے۔

حیرت کی بات ہے کہ کوفہ کے سپاہی جنھوں نے امام حسین علیہ السلام کو گھیر کر قتل کر دیا تھا، وہ پانچ وقت قبلۂ اسلام کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے اور ہر اذان میں حسینؑ کے نانا حضرت محمد رسول اللہ کی گواہی دیتے تھے۔ اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ جب کوفہ کے سپاہیوں کے ہراول دستے سے حسینؑ کا پہلی دفعہ آمنا سامنا ہوا تو دونوں لشکروں نے حسینؑ ابن علیؑ

---

[1] حرہ کے معنی سنگلاخ کے ہیں۔ یہ مدینہ اور عقیق کے درمیان وہ سرزمین ہے جس میں مدینہ کے لوگوں اور یزید کے جرنیل مسلم بن عقبہ کے درمیان جنگ لڑی گئی۔

کے پیچھے نماز پڑھی، یعنی انہیں مسلمان، اہلِ قبلہ اور امامت کے لائق سمجھا۔ ان سپاہیوں میں ایسے لوگ بھی تھے، جنہوں نے اسلامی جنگوں میں شجاعت اور سرفروشی کا مظاہرہ کیا تھا۔ لیکن آخرکار چند گھنٹوں میں ہی ان تمام سابقہ کارگزاریوں کا دفتر لپیٹا گیا اور ہر چیز فراموش ہوگئی۔ پھر نوبت یہ آئی کہ کل کا مسلمان اور امام (حسینؑ) فقط ایک رات گزرنے کے بعد (نعوذ باللہ) کافر گردانا جانے لگا، آخر کیوں؟

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ امام حسین علیہ السلام کو اس لیے قتل کیا گیا کہ انہوں نے یزید کی بیعت نہیں کی اور یہ درست ہے کہ وہ آخری دم تک یزید کی بیعت کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے لیکن خلیفۂ وقت کی بیعت کرنے سے انکار کرنا کوئی جرم نہیں اور اگر جرم ہو بھی تو اس کی سزا قتل نہیں ہے، کیونکہ اس سے پہلے بھی مسلمانوں میں بیعت سے انکار کی مثالیں موجود تھیں۔

مثال کے طور پر صلح حدیبیہ کے دن جب رسول اکرمؐ کو معلوم ہوا کہ قریش نے عثمان بن عفان کے ساتھ دھوکا کیا ہے، تو آپ نے صحابہ سے دریافت کیا کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ تب انہوں نے آپ کے ہاتھ پر اپنی جان میں جان ہونے تک کی بیعت کی اور اگر کوئی بیعت نہ کرنا چاہتا تو ایسا کر سکتا تھا۔ قرآن مجید میں ایسی آیتیں موجود ہیں جن میں مسلمانوں کو جہاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ان آیتوں کے ضمن میں ایسے اشخاص کی جانب اشارہ کیا گیا ہے، جو جہاد میں شریک ہونے سے معذور تھے اور ان کا عذر قبول کر لیا گیا۔ بعض لوگوں نے کوئی جھوٹ موٹ کا بہانہ بنایا تھا، ان کا بہانہ قبول نہیں کیا گیا۔ تاہم رسول اکرمؐ نے نہ صرف یہ کہ انہیں قتل نہیں کیا، بلکہ ان کے ساتھ ایسا سلوک بھی نہیں کیا جو ان کے لیے ناخوشگوار ہو۔ آپ نے ان کا معاملہ

خدائے تعالیٰ کے سپرد کردیا کہ اگر وہ چاہے تو انہیں بخش دے اور اگر چاہے تو سزا دے۔

ایک روایت کے مطابق جب ابوبکر بن قحافہ نے منصبِ خلافت سنبھالا تو امام علی علیہ السلام اور بنی ہاشم کے دوسرے سربرآوردہ اشخاص نے چھ مہینے تک ان کی بیعت نہیں کی [1]۔ پھر جب امام علی علیہ السلام نے لوگوں سے اپنی خلافت کی بیعت لی تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ چند اشخاص جنہوں نے بیعت کرنے سے انکار کیا، امام علیؑ نے ان سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ پس مسلمانوں میں اس سے پہلے بھی خلیفہ کی بیعت نہ کرنے کی مثالیں موجود تھیں اور یہ کوئی جرم نہیں تھا۔ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ امام حسین علیہ السلام تو خلیفہ کے مقابلے پر کھڑے ہو گئے تھے اور ان کا یہ فعل اندرونی شورش کے مترادف تھا۔ ہاں! یہ درست ہے کہ امام حسین علیہ السلام نے یزید کی خلافت، اسکی اخلاقی صلاحیت اور اس کے دعوائے مسلمانی پر نکتہ چینی کی تھی۔ علاوہ ازیں انہوں نے عراق کے لوگوں کے دعوت نامے قبول کیے اور اپنا نمائندہ بھی عراق بھیجا کہ وہ وہاں کے حالات قریب سے دیکھ کر انہیں اطلاع دے۔ پھر اپنے ارادے سے حجاز سے عراق گئے اور عراق میں ابن زیاد کے سپاہیوں کے مقابلے میں جنگ کے لیے ڈٹ گئے۔

لیکن یزید کو فاسق کہنا، عراق کے لوگوں کی دعوت قبول کرنا اور کوفہ کے سپاہیوں کے خلاف جنگ کرنا، ان میں سے کوئی چیز بھی مسلمانوں کے مفاد کے خلاف قیام کے زمرے میں نہیں آتی۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ مسلمانوں

---

[1] طبری حوادث سال یازدہم۔

کا ایک گروہ دوسرے گروہ کے مقابلے میں اٹھ کھڑا ہوا ہے تو قرآن مجید فرماتا ہے کہ جہاں تک ہوسکے مصالحت کے ذریعے معاملے کو ختم کردو۔ پھر اگر قیام کرنیوالا مخالفت پر قائم رہے اور جنگ برپا کرے تو اس کے خلاف لڑو حتیٰ کہ وہ خدا کے حکم کے آگے اپنی گردن جھکا دے[1]

اب ہم دیکھتے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام کیا چاہتے تھے اور اہل کوفہ نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ کیا انھوں نے جنگ کا آغاز کیا؟ کیا وہ جنگ جاری رکھنے پر مصر تھے؟ نہیں ہرگز نہیں! وہ اپنے قیام کے آغاز میں، کوفہ کے لوگوں کی دعوت کے جواب میں اور قیام کا سبب دریافت کیے جانے پر اپنے خطبوں اور گفتگوؤں میں مسلسل یہ کہتے رہے کہ خدا کے حرام کو حلال اور خدا کے حلال کو حرام کردیا گیا ہے۔[2]

ہم جانتے ہیں کہ ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ سنت کو زندہ کرنے اور بدعت کو ختم کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔ چنانچہ وہ اس وقت عراق آئے جب انہیں بے شمار دعوت نامے موصول ہوگئے۔ جس دن ان کا کوفہ کے سپاہیوں کے ہراول دستے سے آمنا سامنا ہوا اور اس دستے کے سردار نے ان سے پوچھا: آپ کیا چاہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: اس سرزمین کے لوگوں نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں ان کے پاس آؤں تاکہ ان کی مدد سے دین کو زندہ کردوں۔ اب اگر وہ اپنی بات سے پھر گئے ہیں تو میں واپس حجاز چلا جاتا ہوں۔ جب انہوں نے دیکھ لیا کہ کوفہ کے سپاہی ابن زیاد کی اطاعت ترک کرنے اور خود ان سے آملنے پر آمادہ نہیں ہیں تو انہوں نے اپنی سی کوشش

---

[1] حجرات۔ آیت ۹ [2] طبری حوادث سال ۶۱ھ

کی کہ جنگ کی نوبت نہ آئے حتیٰ کہ ابن سعد کے ساتھ ان کی جو آخری گفتگو ہوئی اس میں انہوں نے اسے کہا کہ وہ ان کی دو تجاویز میں سے کوئی ایک قبول کرلے۔ اگر کوفہ کا حاکم ان دو تجاویز میں سے ایک کو قبول کرلیتا تو صورت حال یکسر بدل جاتی۔ لیکن ابن زیاد یہ چاہتا تھا کہ حسینؑ کو ذلیل کرے اور یزید کے لیے بیعت لے کر اپنا فرمانبردار بنائے۔ یہ ایک ایسی چیز تھی جسے وہ مردِ آزاد ہرگز قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ جیسا کہ انہوں نے فرمایا:

"میں ہرگز غلاموں کی طرح تمہارے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کروں گا۔"

پس جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ابھی تک اس "کیوں" کا کوئی جواب نہیں ملا۔ حقیقت یہ ہے کہ پرانے تاریخ نویسوں نے تو یہ چاہا ہی نہیں اور یا وہ اجتماعی اقتصادی اور انسانی لحاظ سے کسی حادثے کا تجزیہ کرنے کے قابل ہی نہ تھے ـــــ خواہ وہ کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو۔

انہوں نے بیشتر واقعات کے سیاسی اور عسکری پہلوؤں پر نگاہ رکھی ہے اور اس سے بھی ان کا مقصد محض اصل حادثے کی نشاندہی کرنا رہا ہے۔ اگر ہمارے متقدم تاریخ نویسوں نے فقط روایات نقل کرنے پر اکتفا نہ کیا ہوتا اور اپنا فریضہ اسی طرح انجام دیا ہوتا، جیسے آجکل کے مؤرخ انجام دیتے ہیں تو یقیناً آج تاریخ اسلام کی شکل کچھ اور ہی ہوتی۔

محرم ۶۱ھ کا واقعہ ان متعدد واقعات میں سے ایک ہے جن کی اصل وجہ یا وجوہ کی جستجو کرنی چاہیے اور یہ جستجو بھی اس حادثے کے وقوع پذیر ہونے کے سال یا اس سے چند سال پیشتر تک محدود نہیں رہنی چاہیے۔

ممکن ہے کہ جب اس خونیں داستان کی تحقیق کریں تو ہمیں ابوبکر بن قحافہ کی خلافت اور ظہور اسلام بلکہ رسول اکرمؐ کی پیدائش سے بھی کئی سال پہلے تک کے زمانے کی طرف لوٹنا پڑے کیونکہ یہ حوادث ایک زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں رکھا جا سکتا۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ اس کتاب میں حادثۂ کربلا کا مختلف پہلوؤں سے مطالعہ کریں اور ایک ایسے نتیجے پر پہنچیں جس سے ہم خود مطمئن ہو جائیں اور پھر ممکن ہو گا کہ قارئین بھی ہمارے ساتھ اتفاق کر لیں۔ اگر مجھے اس کام میں کامیابی حاصل ہو جائے تو اس "کیوں" کا جواب بھی دیا جا سکے گا، جو واقعۂ کربلا کے بارے میں ہمیشہ سے موجود ہے۔

ان سوالات کا صحیح جواب حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ہم تاریخ کے دو مرحلوں میں اسلامی معاشرے کو صحیح طور پر پہچانیں۔ ایک تو وہ معاشرہ تھا جس کی تشکیل ہجرت کے گیارھویں سال میں ہوئی۔ اس کو رسول اکرمؐ نے اپنی وفات سے چند ماہ پہلے یہ آیت پڑھ کر خوشخبری سنائی کہ:

"آج کافر تمہارے دین سے ناامید ہو گئے ہیں، پس ان سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو۔" (مائدہ - آیت ۳)

یہ وہ معاشرہ تھا جسے آنحضرتؐ نے فرمایا:

"اے لوگو! میں تمہارے درمیان دو اہم چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، ان میں سے ایک خدا کی کتاب اور دوسری میری عترت ہے۔" [1]

---

[1] بعض غیر شیعی روایات میں "میری سنت" کہا گیا ہے۔

ہمیں چاہیے کہ پہلے ان عناصر کو پہچانیں، جنہوں نے وہ معاشرہ تشکیل دیا تھا۔ پھر اس کا مقابلہ سنہ ۶۰ھ (معاویہ بن ابوسفیان کی موت کے سال) میں موجود معاشرے سے کریں اور دیکھیں کہ جن عناصر نے نصف صدی پہلے کا معاشرہ تشکیل دیا تھا، آیا انہوں نے کوئی ترقی کی یا ساکن رہ گئے یا کچھ کمزور ہو گئے تھے؟ یعنی معاویہ بن ابوسفیان کی موت کے وقت کے مسلمان ابوبکر بن قحافہ کی ابتدائے خلافت کے مسلمانوں سے مقابلتاً کیا نسبت رکھتے تھے؟ کیا ان کے ایمان میں اضافہ ہو گیا یا متزلزل ہو گئے یا بے ایمان ہو گئے تھے؟ اگر وہ متزلزل یا بے ایمان ہو گئے تھے تو کون سے عوامل ان کے تزلزل یا بے ایمانی کا سبب بنے؟ کیا ان عوامل کو معاویہ اور اس کے زمانے نے پیدا کیا یا ان کے بیج پہلے ہی سے مسلمانوں کے معاشرے میں موجود تھے کہ ان کے لیے نشو و نما پانا ممکن نہ تھا اور جونہی انہیں ترقی کے لیے مناسب ماحول نصیب ہوا وہ پھلے پھولے اور انہوں نے کافی طاقت حاصل کر لی، یہ وہ غیر واضح نکات ہیں جن کا تجزیہ کرنا نہایت ضروری ہے۔

قریش کا حصولِ اقتدار

وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ

"اور ہم تو نہیں دیکھتے کہ سوائے رذیل لوگوں کے کسی نے تمہاری پیروی کی ہو۔" (ہودؑ - آیت ۲۷)

جب پیغمبر اسلامؐ نے مکہ میں اپنی دعوت کا آغاز کیا، اس وقت شہر کی سیاسی اور اقتصادی قوت دو طاقتور گروہوں کے ہاتھوں میں تھی۔ اگرچہ اجتماعی ڈھانچے کی ترکیب کے لحاظ سے وہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے لیکن اپنے مشترک مفادات کی حفاظت کی خاطر ایک دوسرے سے تعاون کرتے تھے۔

۱۔ قبائل کے شیوخ کہ جو موروثی رواج کے مطابق قبیلے اور خاندانوں پر حکومت کرتے تھے۔

۲۔۔۔۔ وہ دولتمند لوگ جنہوں نے تجارت اور سودخوری کے ذریعے کافی دولت اکٹھی کرلی تھی۔ ان کی کوشش یہ ہوتی کہ اس کو جمع رکھیں اور جہانتک ہوسکے اس میں اضافہ کیے جائیں۔ مکہ کے معاشرے میں جس کی ان دنوں نیم شہری اور نیم قبائلی تشکل تھی بعض اوقات ایک ہی شخص کو قوت اور دولت کے دونوں ذرائع حاصل ہوتے تھے۔ جیساکہ ولید بن مغیرہ اور ابوسفیان اپنے خاندانوں کے رئیس بھی تھے اور اپنا مال مضاربہ یا تجارت کے لیے دور دراز شہروں میں بھیجتے تھے۔ یہ تھا وہ ماحول کہ جس میں دین اسلام کا ظہور ہوا تھا۔

جیساکہ ہم جانتے ہیں رسول اکرمؐ نے لوگوں کو پہلی دعوت یہ دی کہ وہ کہیں: خدا ایک ہے اور اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے بتوں کو پوجنا چھوڑ دیں۔ تھوڑا سا تامل ہی یہ جاننے کے لیے کافی ہے کہ یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جو ابوسفیان جیسے جہاندیدہ سوداگر اور ابوجہل جیسے عمر رسیدہ سردار کو ناراض کردیتی۔ یہ بڑی سادہ لوحی ہوگی اگر ہم یہ کہیں کہ وہ اپنے کاریگروں کے بنائے ہوئے بتوں کو اپنا خدا سمجھتے اور ان کی پرستش کرتے تھے۔ اسی طرح یہ بھی سادہ دلی ہی ہوگی اگر ہم یہ کہیں کہ وہ لوگ دل سے اس خدا کے معتقد تھے جس کی بے چون وچرا اطاعت کرنی چاہیے اور بت ان کی نظروں میں سادہ دل لوگوں کو بہلائے رکھنے کے ایک وسیلے کے علاوہ کچھ نہ تھے۔ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ اس ذریعے سے عام لوگوں کو فریب دیں اور پھر اس بہلانے سے ان کا مال ہڑپ کریں۔ ہاں تو ایک ایسے شخص کو جو سوائے مال اور قوت بڑھانے کے اور کچھ نہ چاہتا ہو، اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے کہ بتوں کی پرستش کی جائے یا ستاروں یا سورج کے آگے سر جھکایا جائے۔ جو لوگ

سر دھڑ کی بازی لگا کر اپنے ایمان پر ثابت قدم رہے اور ہیں ان کا تعلق کمزور یا متوسط نیز مصیبت زدہ اور تہی دست طبقے سے ہوتا ہے۔ اگر وہ جنگ عقیدے کی بنا پر ہوتی تو وہ مالدار نہیں بلکہ یہ غریب لوگ آنحضرتؐ کی مخالفت میں اٹھ کھڑے ہوتے، جبکہ وہ گروہ جس نے نئے دین کو سب سے پہلے قبول کیا، انہی مظلوموں اور کمزور لوگوں پر مشتمل تھا۔

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ اگر رسول اکرمؐ ان دنوں فقط توحید پرستی کی دعوت دیتے تو قریش ان سے اس قدر ناخوش نہ ہوتے بلکہ وہ سب یا ان میں سے بیشتر ان پر ایمان لے آتے۔ لیکن اگر چھوٹی سورتوں پر غور کیا جائے، جو قرآنی آیات کے پہلے دستے پر مشتمل ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سادہ دعوت کے ساتھ کچھ اور شرائط بھی عائد کی گئی ہیں۔ یہ وہ شرائط تھیں جو براہِ راست یا بالواسطہ سرداروں اور سوداگروں کے مفادات سے ہم آہنگ نہیں تھیں۔[1]

قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

وَيْلٌ لِّكُلِّ .... الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ

وائے ہے ملامت کرنے والے عیب جو پر جو مال جمع کرتا ہے اور گن گن کر رکھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اسے ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ نہیں ایسا نہیں ہے، ضرور وہ حطمہ (دوزخ) میں ڈالا جائے گا۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ حطمہ کیا ہے؟ وہ خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں تک چڑھ جائے گی۔

(ہمزہ - آیات ۱ تا ۷)

---

[1] جیسا کہ آج بھی بعض ایسے مسلمان موجود ہیں جو حقیقی اسلام سے کتراتے ہیں۔ (مترجم)

"ذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِيْنَ .... عَذَابًا اَلِيْمًا"

مجھے ان جھٹلانے والوں سے جو دولتمند ہیں سمجھ لینے دو اور انہیں تھوڑی سی مہلت دے دو۔ بلاشبہ ہمارے پاس شکنجے بھی ہیں، دوزخ بھی ہے، گلے میں پھنسنے والا کھانا اور دکھ دینے والا عذاب بھی ہے۔ (مزمل۔ آیت ۱۱ تا ۱۳)

ان آیات کے معانی پر ایک بار پھر غور کیجیے۔ جو شخص مال جمع کرتا اور یہ خیال کرتا ہے کہ یہی مال اس کی نگہبانی کرے گا، اس کو دوزخ میں پھینکا جائے گا، جو اس کے دل کو بھون کر رکھ دے گا۔ مال جمع کرنے والے یہ نہیں جانتے کہ ہم نے ان کے لیے کیا سزا مقرر کر رکھی ہے۔ تمہیں چاہیے کہ سود مانگے بغیر لوگوں کو روپیہ قرض دو۔

وَمَا اَدْرٰكَ مَا الْعَقَبَةُ .... اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ

کیا تم جانتے ہو کہ عقبہ (گھاٹی) کیا ہے؟ غلام کو آزاد کرنا یا بھوک کے دن کسی یتیم، رشتہ دار یا خاکسار محتاج کو کھانا کھلانا۔ (بلد۔ آیت ۱۲ تا ۱۶)

ظاہر ہے کہ ان آیات میں دولتمند اور طاقتور لوگوں کو بار بار تنبیہہ کی گئی ہے۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو ابوجہل، ولید بن مغیرہ اور ابوسفیان کو بھلے نہیں لگتے تھے۔ جیساکہ ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اکرمؐ کے سب سے بڑے جانی دشمن یہی قبیلوں کے سردار اور دولتمند سوداگر تھے اور آپ کے ثابت قدم پیروکار وہی بے بس غلام اور بے کس لوگ تھے۔ اگر مکہ کے اولین مسلمانوں کی فہرست پر نظر ڈالی جائے تو پتا چلتا ہے کہ عموماً ان کا تعلق ان طبقوں سے تھا:

۱۔ غلام اور مظلوم لوگ جو اپنے ظالم آقاؤں کی زیادتیوں سے تنگ آ چکے تھے

اور پہلی مرتبہ انہیں آزادی اور آسائش کی خوش خبری ملی تھی۔

۲۔۔۔ وہ سوداگر جو دولت اور آمدنی کے لحاظ سے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے، ان کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ امیر کبیر لوگوں سے مقابلہ کرسکیں اور وہ سہولتیں حاصل کرسکیں جو ان لوگوں کو میسر تھیں۔

۳۔۔۔ اشراف کی اولاد جنہیں قبیلے کے رسم ورواج کے مطابق اس بات کی کوئی امید نہ تھی کہ وہ سرداری کے رتبے پر پہنچ پائیں گے۔

۴۔۔۔ چھوٹے موٹے پیشوں سے تعلق رکھنے والے لوگ جنہیں امیر کبیر لوگوں اور قبیلے کے سرداروں کا سخت دباؤ برداشت کرنا پڑتا تھا اور جو ان سے مقابلہ کرنے کی طاقت یا ان کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہیں رکھتے تھے۔

اس بنا پر تھوڑے سے غور کے بعد ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ گو ان مختلف طبقوں کے لوگوں نے ایک دینی عقیدے کے ماننے والے گروہ کی شکل اختیار کرلی تھی، لیکن ضروری شرائط اور وسائل کے نہ ہونے کے باعث ان کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ ان دو گروہوں یعنی سرداروں اور دولتمندوں کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوں، حتیٰ کہ وہ تکالیف اٹھائے بغیر اپنے عقیدہ اور جماعت کی حفاظت بھی نہیں کرسکتے تھے۔ جیسا کہ ہم تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ آخر کار ان لوگوں نے جو نئے نئے مسلمان ہوئے تھے، اپنے مخالفین کے ہاتھوں قسم قسم کی ذلتیں، مصیبتیں اور تکلیفیں اٹھاتے اٹھاتے جلاوطنی کی زندگی اختیار کی اور دوسرے شہروں یا ملکوں میں منتقل ہوگئے۔

ان مصیبت کے برسوں کے آخر میں جب مکہ میں یہ حوادث رونما ہورہے تھے، اس شہر سے پانچ سو کیلومیٹر دور یثرب میں حالات کچھ اور ہی

تھے۔ کیونکہ اس شہر میں ایک اور ہی طرح کا واقعہ ظاہر ہونیوالا تھا۔

مکہ کے برعکس یثرب کی آبادی ان طبقوں پر مشتمل تھی:

۱۔۔۔ متوسط الحال کسان جو محنت کر کے اپنے اور اپنے خاندان کے لیے روزی کماتے تھے۔

۲۔۔۔ معمولی کام کرنے والے کاریگر جو زیادہ سرمایہ اور کافی تجربہ نہ رکھنے کی وجہ سے بڑے بڑے کام کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔

۳۔۔۔ مختلف خاندان جنہوں نے اگرچہ بڑے قبیلوں سے خونی اور سببی رشتے قائم کر رکھے تھے، لیکن وہ ہمیشہ ایک دوسرے کی جان کے درپے رہتے تھے۔ چونکہ ان کے درمیان کسی نہ کسی حد تک طاقت کا توازن برقرار تھا، اس لیے وہ ہمیشہ حالتِ جنگ میں رہتے تھے، بغیر اس کے کہ ان میں کوئی دستہ جیت جائے یا ہار جائے۔

۴۔۔۔ استثمار کرنے والی یہودی اقلیت جو بظاہر کھیتی باڑی کرتی تھی لیکن جیسا کہ اس قوم کا شیوہ ہے" ان لوگوں نے اپنی ذہانت اور تجربے کی بنا پر شہر کے اقتصاد پر قبضہ جما رکھا تھا۔ وہ کمزور قبیلوں کو مسلسل دھمکیاں دیتے رہتے تھے کہ جلد ہی اس قوم میں خدا ایک پیغمبر کو کھڑا کرے گا اور ہم اس کے زیر سایہ عرب کے شہروں اور علاقوں کی حکومت سنبھال لیں گے۔[۱]

دوسری طرف یہ چاروں دستے اپنے آپ کو ایک خاص شکل میں مکہ کی حکومت کے ماتحت پاتے تھے۔ یہ امر واضح ہے کہ اس شہر کے سمجھدار

---

[۱] طبری جلد ۳ صفحات ۱۲۰۹۔۱۲۱۰

لوگ چاہتے تھے کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنے لوگوں کو اس ہنگامہ آرائی اور بدنظمی سے نجات دلائیں جس میں وہ گرفتار تھے۔ اُدھر مکہ میں جو کچھ ہو رہا تھا، آخر ان کو بھی اس کی اطلاع مل گئی۔ پھر جیسا کہ ہم جانتے ہیں انہوں نے رسول اکرمؐ کو اپنے شہر بلایا اور ان کی پیشوائی قبول کرلی۔

قریش کے رؤسا نے بظاہر یہ کوشش کی کہ رسول اکرمؐ کو یثرب جانے سے روک رکھیں۔ لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ آنحضرتؐ کی اور آپ کے صحابہ کی ہجرت کو غنیمت شمار کرتے تھے۔ شاید وہ یہ سمجھتے تھے کہ جو خطرہ انہیں لاحق ہے گویا وہ اس سے بچ گئے ہیں۔ ابھی زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ ہجرت کے دوسرے سال میں یثرب اور مکہ کے درمیان جھڑپ ہو گئی۔ ان بظاہر کمزور لوگوں نے ان طاقتور اور خاندانی لوگوں کو عربستان کی تاریخ میں پہلی دفعہ جو ضرب لگائی، اس سے قریش کو احساس ہوا کہ خطرہ اس سے کہیں زیادہ ہے جتنا کہ وہ سمجھتے تھے۔ لہٰذا وہ یہ جانے بغیر کہ کیا کر رہے ہیں، اپنی سی کوششوں میں لگ گئے۔ انہوں نے مدینہ کے قریب مقیم قبیلوں کو مسلمانوں کے خلاف اکسایا اور یہودیوں کے ساتھ عہد و پیمان کیے۔ چنانچہ ان قبیلوں نے رسول اکرمؐ کے خلاف آپس میں اور قریش کے ساتھ فوجی معاہدے کرلیے۔ لیکن اپنی ان کوششوں سے انہیں کوئی خاص فائدہ نہ پہنچا۔ اب ہجرت کے چھٹے سال میں ان کی آخری کوشش یہ تھی کہ رسول اکرمؐ اور ان کے ساتھیوں کو مکہ میں داخل ہونے سے روکا جائے، اس کا نتیجہ صلحنامۂ حدیبیہ کی شکل میں نکلا۔[1]

---

[1] حدیبیہ مکہ سے نو میل دور ایک مقام ہے۔ رسول اکرمؐ نے ہجرت کے

لیکن یہ کوشش درحقیقت رسول اکرمؐ کے مقابلے میں قریش کی پہلی بڑی سیاسی شکست تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ انہوں نے آنحضرتؐ کو مکہ میں داخل ہونے سے روک کر عربوں کے سامنے ذلیل کیا ہے۔ جبکہ قریش کا اس معاہدے پر دستخط کرنا ایک طرف تو یثرب اور اس کے گرد و نواح میں رسول اکرمؐ کی حکومت کا رسمی اعتراف تھا اور دوسری جانب اس معاہدے نے قریش کے دوسرے قبیلوں سے کیے گئے معاہدوں کو غیر معتبر بنا دیا۔

رسول اکرمؐ کی ہجرت کے آٹھویں سال میں مکہ فتح ہو گیا اور قریش کی جھوٹی شان و شوکت ختم ہو گئی۔ حجاز کے قبیلوں کے سردار جو اب تک اس انتظار میں تھے کہ دیکھیے قریش کا انجام کیا ہوتا ہے، وہ دھڑا دھڑ مسلمان ہونے لگے۔ لیکن ان کے مسلمان ہونے کے یہ معنی نہ تھے کہ انہوں نے دین کی حقیقت کو سمجھ لیا ہے اور اسلامی اخلاق سے آراستہ ہو گئے ہیں۔ قرآن مجید ان کے بارے میں فرماتا ہے:

"قَالَتِ الْاَعْرَابُ ....فِیْ قُلُوْبِكُمْ"

اعراب (بادیہ نشین) کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ ان سے کہہ دیجیے کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ کہو کہ ہم مسلمان ہو گئے ہیں اور ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ (سورہ حجرات۔ آیت ۱۴)

۱۔ چھٹے سال میں مکہ کی زیارت کا قصد فرمایا لیکن قریش کے سرداروں نے انہیں مکہ میں داخل نہ ہونے دیا۔ آخر ایک پیمان باندھا گیا کہ رسول اکرمؐ اور ان کے ساتھی اگلے سال ہتھیار باندھے بغیر تین دن کے لیے مکہ میں آئیں، زیارت کریں اور پھر واپس چلے جائیں۔

شہروں میں رہنے والے لوگ کہ جو مسلمان ہوگئے تھے، اس معاملے میں وہ بھی ان صحرانشینوں سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھے۔ قریش کے سرداروں اور سردارزادوں کے ایک گروہ نے اس وقت اسلام قبول کیا، جب انہوں نے دیکھا کہ دنیا سے فائدہ اٹھانے کے لیے ان کے سامنے ایک نیا دروازہ کھل گیا ہے۔ یہ حدیثِ نبوی جو بخاری نے اپنی کتاب کے مقدمے میں درج کی ہے، اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہے:

"انما الاعمال بالنیۃ .... الی ما ھاجر الیہ"

اعمال کا تعلق نیتوں سے ہے اور ہر شخص کو وہ ملتا ہے جس کی وہ نیت کرتا ہے۔ پس جو شخص خدا اور رسولؐ کی خاطر اپنا گھربار چھوڑتا ہے، اس کی ہجرت خدا اور رسولؐ کے لیے محسوب ہوتی ہے اور جو شخص دنیا کی دولت سمیٹنے یا کسی عورت سے وصال کی خاطر ہجرت کرتا ہے اس کا بدلہ وہی ہے۔

وہ مسلمان ہونے سے پہلے نئے نظام میں وہ مقام حاصل کرنا چاہتے تھے جس کی انہیں خواہش تھی۔ اگرچہ یہ معلوم نہیں کہ جو کچھ وہ زبان سے کہتے تھے آیا وہ ان کے دل میں بھی تھا یا نہ تھا۔

ابن قتیبہ نے ایک داستان بیان کی ہے جو لوگوں کے اس گروہ یعنی منافقوں اور ایسے ہی دوسرے ابن الوقت لوگوں کی نشاندہی کرتی ہے جو ان کی طرف مائل تھے۔

عُیینہ ابن حصن مسلمان ہونے سے پہلے مدینہ آیا۔ مدینہ شہر سے باہر اس کی ملاقات ایک گروہ سے ہوئی۔ عُیینہ نے ان لوگوں سے پوچھا: اس شخص (محمد رسول اللہؐ) کے لوگوں کے ساتھ کیسے تعلقات ہیں؟

انہوں نے جواب دیا: لوگ تین گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک گروہ مسلمان ہو چکا ہے اور وہ لوگ پیغمبرؐ کی حمایت میں قریش اور دوسرے لوگوں سے جنگ کرتے ہیں۔ دوسرے گروہ کے لوگ مسلمان نہیں ہوئے اور وہ مسلمانوں سے جنگ کرتے ہیں۔ تیسرے گروہ کے لوگ پیغمبرؐ کے صحابہ سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور تمہارے ساتھ ہیں اور جب قریش کے پاس جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔

عُیینہ نے پوچھا: اس دستے کو تم نے کیا نام دیا ہے؟

انہوں نے جواب دیا: "منافق"۔

اس نے کہا: اے لوگو! گواہ رہنا کہ میں اس تیسرے گروہ کے ساتھ ہوں۔ جو کچھ تم ان کے متعلق بتاتے ہو، اس کے مطابق مدینہ کے لوگوں میں سے کوئی بھی ان کے جیسا عقلمند نہیں ہے۔[1]

یہ وہی گروہ ہے جس کے بارے میں قرآن مجید فرماتا ہے:

"وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ .... إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُونَ"

جب وہ ان لوگوں کو دیکھتے جو ایمان لائے ہیں تو کہنے لگتے ہم ایمان لائے ہیں اور جب وہ اپنے شیطانوں کے ساتھ خلوت میں بیٹھتے تو کہتے: بلاشبہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور سچ مچ ہم تو ان (مسلمانوں) کے ساتھ مذاق کرتے ہیں۔

(بقرہ۔ آیت ۱۴)

اب اگر ہم یہ کہیں کہ ان تمام نو مسلموں نے کلمۂ شہادت

---

[1] عیون الاخبار جلد ۳ صفحہ ۳۷

پڑھنے کے ساتھ ساتھ کینہ وری، کمزوروں کی تحقیر، دوسروں کے مال اور آبرو پر تجاوز، اپنے خاندان پر ناز، مال جمع کرنے اور دوسروں پر ظلم ڈھانے جیسی اپنی پرانی عادتیں چھوڑ دیں جو زمانۂ جاہلیت کے عربوں کی زندگی کا لازمہ تھیں، تو یہ بڑی خوش فہمی اور سادہ دلی ہوگی۔ پھر یہ اور بھی بڑی خوش گمانی ہوگی اگر ہم یہ کہیں کہ رسول اکرمؐ کے تمام صحابہ نے چند سالوں میں اتنی تربیت حاصل کرلی تھی کہ وہ اسلامی خصلتوں کا نمونہ بن گئے تھے۔

مدینہ میں رسول اکرمؐ کے دس سال کے قیام کے دوران آنحضرتؐ کی روحانی طاقت اور مسلمانوں کی غزوات اور سرایا میں مصروفیت نے اس بات کی مہلت نہ دی کہ ان بظاہر مسلمانوں کے اندر کا شیطان باہر نکل سکے۔ تاہم جب کبھی اسے موقع ملتا وہ اپنا سر باہر نکالتا تھا اور اپنے دانت دکھاتا تھا۔

مفسرین نے سورۂ حجرات کی نویں آیت کی شانِ نزول کے بارے میں لکھا ہے کہ عبداللہ ابن ابی اور عبداللہ ابن رواحہ کے درمیان تلخ کلامی اور مار پیٹ تک ہوگئی۔ انہوں نے کہا ہے کہ جھگڑا انصار کے دو آدمیوں کے حق کے بارے میں تھا اور جس شخص کا خاندان بڑا تھا، اس نے دوسرے سے کہا کہ میں اپنا حق تم سے زبردستی لے لوں گا۔ قرآن مجید میں کچھ اور آیات بھی ہیں جن کے بارے میں مفسرین نے لکھا ہے کہ وہ ایک قبیلے کی دشمنی رفع کرنے کے لیے ہیں جو کبھی بھی ظاہر ہو جاتی تھی۔ جیسا کہ لکھا گیا ہے کہ ایک دن مغیرہ بن شعبہ اور عمرو بن عاص کے درمیان تو تو میں میں ہوگئی۔ مغیرہ نے عمرو کے ساتھ بدکلامی کی۔ عمرو نے کہا: "ہصیص کہاں ہے؟ (اس نے اپنے دادا کا نام لیا)۔ ابن عبداللہ نے کہا: "انا للہ وانا الیہ راجعون"۔

تم جاہلیت (قبیلہ) کے راستے پر چل پڑے۔ تب عمرو نے اپنے اس فعل کے کفارے کی خاطر تیس غلام آزاد کیے۔[1]

بہرحال کسی نہ کسی طرح وہ عادتیں ایک مدت کے لیے فراموش ہوگئیں اور مکہ و مدینہ کے معاشروں میں ایک ایسی وحدت پیدا ہوگئی، جس کی بنیاد اسلامی برادری، خاندانی امتیازات کی تنسیخ اور تقویٰ کی رعایت پر تھی کہ جس کی قرآن مجید نے بار بار تاکید کی ہے لیکن جب آنحضرتؐ نے رحلت فرمائی اور اسلام نے جزیرہ نمائے عرب کی سرحدوں سے باہر قدم رکھا تو غیر عرب لوگوں نے اس دین کی وہ عادات قبول کیں جن کی بنیاد غیر قبائلی نظام پر تھی۔ اس دوران میں کثیر مال و دولت مدینہ پہنچنے لگا اور مسلمان سردار میدان جنگ میں لڑنے کی بجائے محلوں میں آرام سے رہنے، کھیتی باڑی کرنے اور باغ لگانے میں دلچسپی لینے لگے۔ اس طرح اشرافیت کی بھولی بسری نشانیاں دوبارہ ظاہر ہونے لگیں، بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی نشانیاں آنحضرتؐ کی رحلت کے فوراً بعد ہی دکھائی دینے لگیں۔

قریش کے لوگ جنہوں نے بتوں کی پرستش اس وقت ترک کی، جب انہوں نے دیکھا کہ مدینہ کے سپاہی مکہ کے دروازے پر دستک دے رہے ہیں۔ تاہم وہ یہ چاہتے تھے کہ نئی حکومت میں وہی رئیس اور فرمانروا ہوں لیکن چونکہ مدینہ کے لوگوں نے رسول اکرمؐ کو اپنے پاس بلایا اور ان کا ساتھ دیا تھا۔ نیز انہی کی کوشش سے اسلام مکہ سمیت تمام عربستان میں پھیلا تھا، اس بنا پر وہ اس ریاست اور فرمانروائی میں کچھ

---

[1] کنز العمال جلد ۱ صفحہ ۳۶۳ دوسرا ایڈیشن

زیادہ حصہ چاہتے تھے۔

جب وہ لوگ مسلمانوں کے لیے ایک امیر کا انتخاب کرنے کی خاطر سقیفہ میں جمع ہوئے تو قبیلہ خزرج کے رئیس سعد ابن عبادہ انصاری نے کہا: "ایک امیر ہم میں سے اور ایک تم میں سے ہو" ایک روایت میں ہے کہ ابوبکر بن قحافہ نے سعد کے جواب میں کہا: رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ مسلمانوں کے پیشوا قریش ہوں گے یعنی حکومت مکہ کے ہاتھ میں ہوگی اور مدینہ والے بدستور ماتحت رہیں گے!

میں اس حدیث کے درست یا نادرست ہونے کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ اپنے آپ کو ایک ایسے کام میں مصروف کرلوں جو مسلمانوں کی ایک جماعت نے چودہ صدیاں پہلے انجام دیا تھا۔ میں نہیں چاہتا کہ مسلمانوں کے یا کم از کم مسلمانوں کے ایک گروہ کے جذبات کو ٹھیس پہنچاؤں لیکن اگر ابوبکر بن قحافہ جیسے ایک بڑے صحابی نے واقعی یہ بات کہی تھی تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ جس چیز کو اسلام اور قرآن نے اہمیت دی تھی یعنی 'تقویٰ' وہ کم از کم مسلمانوں کی حکومت کے معاملے میں مفید نہیں ہے۔ لازمی طور پر اس حدیث کے معنی یہ ہیں کہ اگر بالفرض دو شخص حکومت کے دعویدار ہوں اور ان میں سے ایک تقویٰ میں کمتر ہو لیکن اس کا تعلق قریش سے ہو اور دوسرا زیادہ متقی ہو تو بھی جو شخص قبیلۂ قریش میں سے ہے اس کا حق مقدم ہوگا۔ بلکہ یہ بھی ضروری نہیں کہ مسلمانوں کا نیا فرمانروا پارسا، پرہیزگار، فقیہہ اور لائق ہو۔ کیونکہ جو چیز اسے قابل احترام بناتی ہے وہ اس کے قبیلے اور خاندان کی بزرگی اور شرافت ہے۔ مختصر یہ کہ اس کا قبیلۂ قریش کا فرد ہونا اس کی لیاقت اور

عزت کی ضمانت ہے۔ آخر کیوں؟ چونکہ جاہلیت کے زمانے میں حجاز کا مقدر قریش کے ہاتھوں میں تھا' اس لیے رسول اکرمؐ کے بعد قریش کو ہی مسلمانوں کی حکومت کی باگ ڈور سنبھالنی چاہیے۔ جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ یہ قریش ہی تھے جو پچاس سال میں پچیس سال تک اسلامی شہروں کے حاکم بنے رہے۔ سیدھے سادے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ بس یہ قریش ہیں اس لیے یہ جو کچھ بھی کہیں دوسروں کو اسے قبول کر لینا چاہیے اور اس پر اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔

اگرچہ ابوبکر بن قحافہ سے حدیث نبوی کے نام سے جو کچھ نقل کیا گیا ہے وہ اہل سنت کی معتبر کتابوں میں تحریر ہے لیکن بدقسمتی سے نقل حدیث اور تحریری سند کے زمانے میں دوسو سال کا فاصلہ حائل ہے۔ ممکن ہے اس طویل مدت میں جعلسازی' تخلیط اور تحریف وقوع پذیر ہوئی ہو ــــ جیسے کہ ہوئی ہے۔ تاہم یہاں میرا کام حدیث پر رائے زنی کرنا نہیں ہے۔ بس اس دن جو لوگ سقیفہ کے مجمع میں موجود تھے' انہوں نے مسلمانوں کا مفاد اسی میں دیکھا اور قریش کے ایک شخص کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اس دن سے لے کر چوبیس سال تک دو اور افراد کہ جن کا تعلق قریش سے تھا' مسلمانوں کے حاکم بنے۔ ابوبکر بن قحافہ نے رسول اکرمؐ کی روش میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں کی۔ عمر بن خطاب نے فراست اور سخت گیری کے ساتھ جہاں تک ہوسکا عدالت کے اجراء کی کوشش کی۔ عثمان بن عفان نے اپنے پیشروؤں کی روش کو زندہ رکھنا چاہا لیکن وہ ایسا نہ کر سکے' کیوں؟ اس لیے کہ بیس سال سے بھی کم مدت میں حکومت میں عمل دخل کا حق قریشی عوام کے ہاتھوں سے نکل کر اس قبیلے کے ایک خاص خاندان یعنی بنی امیہ کو حاصل

ہو گیا۔ جس دن ابوبکر اور دوسرے لوگ سقیفہ میں جمع ہوئے، انہوں نے شاید اس بات پر غور نہیں کیا کہ ممکن ہے کہ قریش کا یہ امتیاز دوسرے امتیازات کا پیش خیمہ بن جائے اور مسلمانوں کی حکومت کو انتخابی حکومت سے موروثی حکومت میں تبدیل کر دے۔ اس دن شاید انہیں یہ خیال نہیں آیا کہ قریش کو یہ امتیاز دے کر وہ دوسرے قبیلوں میں ناراضی کا بیج بو رہے ہیں اور کم و بیش ایک قبیلے کی دوسرے قبیلوں پر برتری حاصل کرنے کی تصدیق کر رہے ہیں۔ پھر دوسرے قبیلے بھی یہ سوچ سکتے ہیں کہ آخر ان میں قریش کے مقابلے میں کیا کمی ہے؟ اس وقت وہ جو چیز چاہتے تھے وہ حکومت کا فریضہ ایک شخص کے سپرد کرنا اور ہونے والے فتنہ و فساد کا سدِباب تھا۔ اگر ان کے بعد آنے والی ایک یا دو نسلیں خلوص قلب، ہمدردی اور دینی غیرت کے معاملے میں اس نسل جیسی ہوتیں تو شاید ایسے نتائج ظاہر نہ ہوتے لیکن جب کسی معاشرے میں ایک اصول منسوخ ہو جائے تو کون اس امر کی ضمانت دے سکتا ہے کہ آنے والی نسلیں اپنی منفعت کی خاطر دوسرے اصولوں کو منسوخ نہیں کریں گی۔ تاہم صرف قریش کو حکومت کا حق دینے کا یہ ایک فطری نتیجہ ہے کہ حکومت میں اموی خاندان کی مداخلت سے اموی حکومت، اس سے موروثی سلطنت اور موروثی سلطنت سے مطلق العنان اموی حکومت میں تبدیل ہو گئی۔ حتیٰ کہ ان کے کاموں میں لوگوں کی مداخلت کا حق سلب ہو گیا، جیسا کہ ان پچاس سالوں کے آخری بیس سالوں میں ہوا۔ اب اس بات کا کوئی سوال نہ تھا کہ حاکم کو کیا کرنا چاہیے؟ وہ عادل ہو یا نہ ہو؟ اگر وہ عدالت کے خلاف کام کرے تو اسے سرزنش کی جائے یا نہ کی جائے؟ ان سالوں میں جو بات اہم معلوم ہوتی تھی وہ یہ تھی کہ کیا کیا جائے تاکہ حاکم راضی رہے۔

یمانی اور مضری عربوں کا مسابقہ

اَفَاِئْن مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ط

اگر محمدؐ مر جائیں یا مارے جائیں تو کیا تم اپنے ماضی کی طرف لوٹ جاؤ گے؟ (آل عمران - آیت ۱۴۴)

جیسا کہ آپ جانتے ہیں اسلام جزیرۃ العرب کے ایک بڑے شہر مکہ میں ظاہر ہوا۔ شاید اب تک آپ نے جزیرۃ العرب کی جغرافیائی، سیاسی اور طبیعی وضع کے بارے میں چند کتابیں یا مقالے پڑھے ہوں۔ اگر آپ کو اس کی فرصت نہیں ملی تو کم از کم ایک دفعہ اس سرزمین کے نقشے اور جغرافیائی محل وقوع پر نظر ڈالیں۔ جزیرۃ العرب یا جزیرہ نمائے عربستان تپتے ہوئے صحراؤں اور بے آب و گیاہ پہاڑوں پر مشتمل ہے، جنہیں سورج کی تیز اور مسلسل دھوپ نے ایک خاص رنگ اور نظارہ دے دیا ہے۔ اس سرزمین کا شمالی حصہ صحرائے کفود ہے، جو بادیۂ شام سے جا ملتا ہے۔

اس کا مشرقی اور شمال مشرقی حصہ صحرائے دھنا، ہے، جو رُبع الخالی تک پھیلا ہوا ہے۔ ربع الخالی جسے بعض اوقات الدّھنا، بھی کہا جاتا ہے اور جو نجد اور الاحسار کے درمیان ہے، وہ اس جزیرہ نما کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔ یہ وسیع بیابان پہلے کی طرح ہمارے اس زمانے میں بھی تقریباً خالی پڑا ہے۔

جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی حصے کو چھوڑ کر باقی خطوں میں بارش کم اور بے قاعدگی سے ہوتی ہے جو موسم گرما اور بہار کے آغاز میں ہوتی ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سالہا سال میں تھوڑی سی بارش بھی نہ برسے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس خشک علاقے میں مسلسل کئی سال اتنی زبردست بارش ہو کہ سیلاب آجائے جو ہر چیز کو بہالے جائے اور ریت کے تودوں میں دفن کردے۔ سیلاب کا پانی زمین میں جذب ہو جانے کی وجہ سے جگہ جگہ تھوڑا سا پانی پھوٹ بہتا ہے۔ یہ پانی گڑھوں میں جمع ہو جاتا ہے اور چھوٹے چھوٹے خاندان ان گڑھوں کے کنارے ڈیرے ڈال دیتے ہیں۔ صحرائی عرب پانی کی تلاش میں ہمیشہ ایک سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس علاقے میں وہ قوانین اپنا کوئی وجود نہیں رکھتے جو شہروں میں رہنے والوں نے بہتر زندگی گزارنے کے لیے تیار کیے ہیں۔ ان علاقوں میں لوگوں کی تعداد بہت کم ہے اور یہی چھوٹے چھوٹے گروہ باہم مل ملا کر مسلسل سفر کرتے رہتے ہیں۔

لیکن جنوب میں چونکہ طبیعی حالات سازگار ہیں اور بحیرۂ احمر کا ساحل اقتصادی ترقی کے لیے معاون ہے، اس لیے وہاں کی زندگی زیادہ منظم اور آبادی نسبتاً گنجان ہے۔ اس قدرتی محل وقوع کے مطابق خاص طور پر وہاں کے لوگوں میں دیہاتی اور شہری قوانین کا رواج ہو گیا

ہے۔ ہر ایسے ماحول میں لوگ اپنی گزر بسر کے لیے محنت اور کوشش کی بنا پر فطری لحاظ سے دو طبقوں میں یا زیادہ بہتر الفاظ میں دو معاشرتی گروہوں میں بٹے ہوتے ہیں، جن میں سے ایک گروہ شہری یا ساکن اور دوسرا خیمہ نشین یا متحرک ہوتا ہے۔

دعوت اسلام کے آغاز میں اس سرزمین کے رہنے والوں کا ایک بڑا حصہ دوسرے گروہ یعنی خانہ بدوشوں پر مشتمل تھا۔ ہمارے دور میں بھی جب کہ جدید ترین ماڈل کی موٹر کاریں اور یورپ اور امریکہ میں بنے ہوتے ٹرانزسٹر ریڈیو اور دوسرے بہت سے آلات شیخ کے خیمے میں دکھائی دیتے ہیں۔ جزیرہ نما کی آبادی میں اکثریت خیمہ نشین لوگوں ہی کی ہے۔

خیمہ نشین صحرا کا فرزند ہے، وہ نیلے آسمان کے سائے اور وسیع بیابان کے دامن میں پروان چڑھتا ہے۔ اسی بنا پر وہ تندرست، طاقتور اور آزاد ہوتا ہے اور ان پابندیوں سے لاپروا ہوتا ہے جو شہری زندگی نے لوگوں کو بطور تحفہ دی ہیں اور انہوں نے اپنے آپ پر عائد کر رکھی ہیں۔ وہ ان چیزوں سے اس قدر بے نیاز ہوتا ہے کہ اگر وہ چند دن کے لیے اونی عبا اور بالوں سے بنے ہوئے خیمے کو چھوڑ کر نرم اور خوبصورت لباس پہنتا اور شاندار محلوں میں ٹہلتا ہے تو کہتا ہے: "مجھے یہ زندگی پسند نہیں، میں چاہتا ہوں کہ اسی خیمہ کی زندگی کی طرف لوٹ جاؤں اور اس ریشمی قمیض کی بجائے موٹی جھوٹی عبا پہن لوں۔"[1]

---

[1] کہا جاتا ہے کہ معاویہ ایک دن یزید کی ماں میسون کے پاس آیا جو ایک خیمہ نشین خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اس نے دیکھا کہ وہ اسی مضمون کے اشعار گنگنا رہی ہے، اس پر معاویہ کو اسقدر طیش آیا کہ اس نے اسے اپنے بیٹے یزید سمیت واپس صحرا میں بھیج دیا۔

صحرا میں واحد اجتماعی زندگی قبیلے پر مشتمل ہوتی ہے اور قبیلہ چند خاندانوں کے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہنے سے بنتا ہے۔ ہر قبیلے کا ایک شیخ ہوتا ہے جو شیخ، حاکم، قاضی، قانون گزار، سپہ سالار اور اپنے لوگوں کا مہربان باپ ہوتا ہے۔ اس معاشرے میں جو چیز قانون بناتی ہے اور فیصلے کرتی ہے۔ حتیٰ کہ جو چیز عقیدہ پیدا کرتی ہے اور اسے تقویت دیتی ہے وہ شیخ کی رائے ہے۔ شیخ کو ان تمام صفات اور امتیازات کا حامل ہونا چاہیے جو اس منصب کے لیے ضروری ہیں۔ چنانچہ اسے دلیر، ہوشمند، مستقل مزاج اور جوانمرد ہونا چاہیے۔ شیخ میں جوانمردی کی صفت دوسری صفات کے مقابلے میں زیادہ دیکھنے میں آتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ سرفروشی کے درجے پر پہنچ جاتی ہے۔ پھر یہ سرفروشی بھی ایسی ہوتی ہے کہ بعض اوقات عقلی فیصلے سے مطابقت نہیں رکھتی۔ وہ فقط اپنے لوگوں کے دفاع کے لیے ہی جان خطرے میں نہیں ڈالتا بلکہ اگر کسی جانور نے اس کے خیمے کے سائے میں پناہ لی ہو تو اسے بچانے کے لیے بھی جنگ و جدال پر آمادہ ہو جاتا ہے۔[1]

---

[1] مشہور مثل "احمی من مجیر الجراد" کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ کسی قبیلے کے رئیس نے آدمیوں کا ایک گروہ دیکھا جو بورے اور مختلف اوزار لے کر اس کے خیمے کے پاس آ پہنچا تھا۔ اس نے پوچھا: تم لوگ کیا چاہتے ہو؟" انہوں نے جواب دیا: اس رات ایک ٹڈی دل تمہارے خیمے کے پاس بیٹھا ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ سورج نکلنے سے پہلے ان ٹڈیوں کو پکڑ لیں"۔ اس نے کہا: ٹڈیاں میری پناہ میں آئی ہیں اور میں تمہیں اس امر کی اجازت نہیں

جوانمردی، جاں نثاری اور سرفروشی کی خصلت جس کا اعلیٰ نمونہ شیخ میں موجود ہوتا ہے، وہ عام صحرا نشینوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ یہ آزادی اور صاف طینتی وہ اپنے معلم یعنی وسیع صحرا، پرسکون ماحول اور صاف فضا سے سیکھتا ہے لیکن یہ صرف ان لوگوں کی ذہنیت کا ایک رخ ہے۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہی پرسکون اور جاں نثار شخص اچانک بپھر جاتا ہے اور دشمنی پر اتر آتا ہے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے، جنگ کرتا ہے اور دوسروں کو قتل کرتا ہے حتیٰ کہ فتحیاب ہوتا ہے یا خود بھی مارا جاتا ہے۔ اگر کسی دوسرے قبیلے کا اونٹ اس کی اجازت کے بغیر اس کے قبیلے کی چراہ گاہ میں گھس آتے اور وہ اس چیز کو اپنی اور اپنے قبیلے کی توہین سمجھے تو ذرا سی دیر میں جنگ کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور یہ جنگ ایک دن یا ایک ہفتہ یا ایک مہینہ یا ایک سال نہیں بلکہ چالیس چالیس سال تک جاری رہتی ہے۔ ان چالیس سالوں میں سیکڑوں بوڑھوں اور جوانوں، نوعمر لڑکیوں اور لڑکوں حتیٰ کہ بلیوں اور کتوں تک کو تہ تیغ کر دیا جاتا ہے اور کوئی یہ نہیں سوچتا کہ وہ کیا کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے۔ زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ ان جنگوں کے بارے میں رزمیہ اشعار، قصیدے اور قطعے تیار کیے جاتے ہیں۔ بچے اور نوجوان انہیں یاد کر لیتے ہیں، وہ ایک

دے سکتا کہ تم انہیں کوئی تکلیف پہنچاؤ۔" یہ کہہ کر اس نے نیزہ اٹھایا اور گھوڑے پر سوار ہو کر ان لوگوں کے بالمقابل کھڑا ہو گیا۔ حتیٰ کہ سورج نکل آیا اور ٹڈیاں اڑ گئیں۔ پھر اس نے کہا: "ٹڈیاں میرے احاطہ سے اڑ گئی ہیں۔ اب جو تمہارا جی چاہے کرو۔"

نسل سے دوسری نسل کو سینہ بسینہ منتقل ہوتے رہتے ہیں اور اکثر اوقات کشت و خون ہونے کا سبب بنتے ہیں۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کچھ لوگ مل بیٹھتے ہیں، وہ ہنستے کھیلتے اور اپنا وقت خوشی سے گزارتے ہیں۔ اچانک کوئی شعر یا جملہ کسی شخص کے دماغ میں آتا ہے اور وہ اسے دانستہ یا نادانستہ اپنی زبان پر لے آتا ہے۔ یہ شعر یا جملہ زبان سے ادا کرنے کی دیر ہوتی ہے کہ دنگا فساد شروع ہو جاتا ہے، کیونکہ اس جگہ کسی قوم یا قبیلے کا کوئی فرد موجود ہوتا ہے، جس پر طنز کیا جاتا ہے یا اسے طعنہ دیا جاتا ہے۔ یہ باہمی مقابلہ اور اپنے آپ کو کسی سے کم نہ سمجھنا بلکہ دوسروں سے برتر سمجھنا، رعد کی طرح گرجنا اور برق کی طرح جلانا ان صحرانشینوں کی فطرت کا دوسرا رُخ ہے جو ان کی جوشیلی طبیعت اور متلون مزاجی کا نتیجہ ہے۔ گویا کہ صحرا کے فرزند میں یہ دو صفات پائی جاتی ہیں: بیحد دلاوری، محبت اور جاں نثاری ــــ بے حساب غصہ اور دشمنی۔

جب عرب کے لوگ رفتہ رفتہ اسلام کے پیرو ہونے لگے اور مسلمان مکہ سے یثرب چلے گئے تو وہ ان تکالیف سے محفوظ ہو گئے جو انہیں دشمنوں کے ہاتھوں پہنچتی تھیں۔ اس دوران میں جب مختلف قبیلے یکے بعد دیگرے مسلمان ہو گئے تو رسول اکرمؐ نے صحرانشینوں کی ذہنیت کے ان دو پہلوؤں کو اسلام کی ترقی کے لیے استعمال کیا۔ انہوں نے ان کی صاف دلی، ارادے کی پختگی اور جاں نثاری کی صفت کے پیش نظر ان میں اسلامی بھائی چارہ قائم کیا۔ یوں ان کی باہمی محبت اس قدر بڑھی کہ مفسرین نے سورۂ حشر کی نویں آیت کے بارے میں لکھا ہے:

"جس دن بنی نضیر سے حاصل کیا ہوا مال غنیمت تقسیم ہو رہا تھا"

رسول اکرمؐ نے انصار سے فرمایا: اگر تم چاہو تو مہاجرین کو اس غنیمت میں سے حصہ دے دو ورنہ یہ سارا مال تمہارا ہے۔ انصار نے جواب دیا: نہ صرف یہ کہ ہم سارے کا سارا مالِ غنیمت انہیں دینا چاہتے ہیں بلکہ اپنے گھر اور اپنا مال بھی ان کے ساتھ تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ اس آیت کی شان نزول کے سلسلے میں کچھ اور قصے بھی بیان کیے گئے ہیں۔ تاہم وہ سب ایک ہی حقیقت کا پتا دیتے ہیں اور وہ مسلمانوں کی ایک دوسرے کے ساتھ مساوات بلکہ دوسرے کو اپنے آپ سے مقدم سمجھنا ہے۔ مسلمانوں میں یہ بھائی چارہ رسول اکرمؐ کے بعد بھی قائم رہا۔ چنانچہ جب عمر بن خطاب نے شام کے مالِ غنیمت کے حصے ترتیب دیے تو بلال سے جو جہاد کی خاطر شام گئے تھے، پوچھا: "بلال آپ اپنا حصہ کسے دیں گے؟" انہوں نے جواب دیا: "ابورویحہ کو جنہیں رسول اکرمؐ نے میرا بھائی بنایا تھا"۔[1]

بیابان میں رہنے والوں کی ذہنیت کے دوسرے پہلو یعنی تند مزاجی اور ضد کو آنحضرتؐ نے دین کی خاطر جہاد اور جنگ کی راہ پر ڈالا تاکہ وہ خون جو اونٹوں اور چراگاہوں کے لیے بہا دیا جاتا تھا وہ خدا کی راہ میں اور دین کی سربلندی کے لیے بہایا جائے۔ آپ نے مسلمانوں کو بتایا کہ میدان جنگ میں ان کے لیے دو راستے کھلے ہیں اور ان دونوں میں سے ہر ایک راستہ ان کے لیے سودمند ہے۔ اگر وہ قتل ہو جائیں تو بہشت میں جائیں گے اور اگر کافروں کو قتل کریں تو مالِ غنیمت حاصل کریں گے۔ علاوہ ازیں ان دشمنیوں کو جو جاہلیت کے زمانے سے ان

---

[1] ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۱۲۷

لوگوں کے دلوں میں گھر کیے ہوئے تھیں، جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی خاطر آنحضرتؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا:

"اے لوگو! ہر وہ خون جو جاہلیت کے زمانے میں بہایا گیا وہ نظر انداز کیا جاتا ہے اور وہ پہلا خون جو میں نظر انداز کرتا ہوں ربیعہ بن حارث بن عبد المطلب کا ہے"۔[1]

ربیعہ نے بنی لیث کا دودھ پیا تھا اور قبائلی رسوم و رواج کے مطابق اس کا شمار انہی لوگوں میں ہوتا تھا، اسے بنو ہذیل نے قتل کر دیا تھا۔ جب رسول اکرمؐ نے مدینہ کے قیام کے دوران مشرکوں سے جنگ کرنے کے لیے مسلمان سپاہیوں کے دستے بھیجے، اُس دن سے لیکر اس دن تک جب مکہ فتح ہوا، مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ جب وہ اپنی سرزمین پر عرب نسل کے لوگوں سے لڑیں گے تو جسے وہ قتل کریں گے وہ عرب بے شک ہو، لیکن مسلمان نہیں ہوگا۔

آنحضرتؐ کے بعد ابو بکر بن قحافہ، عمر بن خطاب اور عثمان بن عفان کے زمانے میں یعنی ایک چوتھائی صدی کی مدت میں عرب دیکھتے تھے کہ وہ عرب سے باہر دین کی ترقی کی خاطر غیر عرب اور غیر مسلمان لوگوں سے جنگ کر رہے ہیں۔ ان سالوں میں عربستان کے اندر جنگ اور عربوں کی آپس میں معرکہ آرائی ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکی تھی لیکن ۳۵ھ میں جب طلحہ اور زبیر نے امام علی علیہ السلام سے کنارہ کشی اختیار کی اور بی بی عائشہ کو بصرہ لے گئے اور قصاصِ عثمان کا بہانہ بنایا تو آخر کار جنگ

---

[1] طبری حوادث سال دہم

چھڑ گئی۔ اس وقت عربوں کی زندگی کی تاریخ کا ورق یکلخت الٹ گیا اور اس کے صفحات پیچھے کی طرف پلٹ گئے۔ پھر عرب کی سرزمین پر ایسی جنگ ہوئی کہ پچھلے پچیس سالوں میں اس کی مثال نہیں ملتی تھی۔ اس جنگ میں نہ صرف یہ کہ عرب کے سامنے عرب آکھڑا ہوا بلکہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے خلاف ڈٹ گیا۔ وہ لوگ اس پہلی جنگ کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے کیونکہ ان کی زندگی میں یہ صفحہ ابھی نیا نیا کھولا گیا تھا لیکن زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ انہوں نے دیکھا، وہ اپنے سے ایک صدی پہلے کی تاریخ دہرا رہے ہیں۔ اگر اس نسل نے یا اس کے بیشتر افراد نے دین کا سبق اس طرح سیکھا ہوتا، جس طرح اسے سیکھنے کا حق ہے اور پھر اسے یاد رکھا ہوتا تو وہ بھی ان لوگوں کی طرح جو رسول اکرمؐ کے ہم رکاب لڑتے تھے، اطمینان اور یقین کے ساتھ لڑتے یا کم از کم اپنے امام اور حاکم کے سامنے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیتے تو ممکن تھا کہ وہ اس پاتال میں گرنے سے بچ جاتے لیکن جیسا کہ ہم ایک اور باب میں پڑھیں گے، دین کے معاملات اور لوگوں کے معتقدات میں بھی خلل پیدا ہو گیا تھا اور اس سے صورت حال کچھ اور مشکل ہو گئی تھی۔[1]

امام علیؑ کے بہت سے سپاہیوں کے لیے ممکن نہ تھا کہ جمل اور صفین کی جنگوں اور بالخصوص جنگِ جمل کہ جس کی کمان رسول اکرمؐ کی ایک بیوی کے ہاتھ میں تھی، اس میں اپنی شرکت کا تجزیہ اس منطق کے مطابق کریں جس کے وہ خوگر ہو چکے تھے۔ ہم جو اس وقت ان حوادث کا مطالعہ

---

[1] طبری حوادث سال ۳۶ ہجری

کر رہے ہیں، ہمارے لیے یہ ایک سیدھی سی بات ہے کہ جس طرح ان خارجی دشمنوں کے خلاف جہاد واجب ہے جو اسلامی معاشرے کے لیے خطرے کا موجب ہوں، اسی طرح داخلی طور پر حکومت کے خلاف بغاوت کرنے والوں کی سرکوبی بھی واجب ہے لیکن اس زمانے کے لوگ یا ان میں سے بیشتر اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ اس کا ثبوت ہمیں جنگِ جمل کے خاتمے پر ملتا ہے، جب کہ امام علیؑ نے فرمایا: ان مقتولین کے مال میں سے کوئی چیز نہ لو!؎ تب کچھ لوگ کہنے لگے یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ان کا خون تو ہم پر حلال ہو اور ان کا مال حرام ہو کیونکہ فاتح سپاہی اس بات کے منتظر تھے کہ سابقہ جنگوں کی طرح مقتولوں کا مال لوٹ کر آپس میں تقسیم کر لیں۔ امام علیؑ نے ان سے فرمایا: جاؤ اور اپنے زخمیوں کی مرہم پٹی کرو! انہوں نے جواب دیا: ہم مال غنیمت حاصل کرنے آئے ہیں، وعظ سننے نہیں آئے۔ امام علیؑ نے فرمایا: ان مقتولوں اور شکست تسلیم کرنے والوں نے اسلامی قانون کے مطابق شادیاں کیں اور ان کے بیوی بچے مسلمان ہیں۔ نیز انہوں نے اسلامی قانون کے مطابق کاروبار کیا اور مال حاصل کیا ہے۔ ہاں مگر یہ اپنے امام کے مقابلے پر اٹھ کھڑے ہوئے، اس لیے ان کی سرکوبی کرنا ہمارا فرض تھا۔ پھر بھی چونکہ یہ مسلمان تھے اس لیے ان کا مال ان کے ورثا کا حق ہے۔ تاہم وہ لوگ اس منطق کو سمجھ نہ سکے کہ جو ان کے لیے بالکل نئی چیز تھی۔ لہٰذا امام علیؑ نے انہیں مطمئن کرنے کے لیے ایک اور طریقہ اختیار کیا اور فرمایا: اے لوگو! اگر یہ طے کر لیا جائے کہ مقتول اور

؎ طبری حوادث سال ۳۶۔

شکست خوردہ لوگوں کی عورتوں کو قیدی بنانا ہے تو پھر یہ بتاؤ کہ عائشہ تم میں سے کس کے حصے میں آئیں گی؟ اس پر وہ لاجواب ہو گئے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ پھر بھی وہ معاملے کی تہ تک نہیں پہنچ سکے۔ وہ چیز جو وہ سمجھے یہ تھی کہ اس جنگ کی نوعیت پہلے لڑی گئی جنگوں سے مختلف ہے۔ ان کے دلوں میں یہ شک پیدا ہوا کہ اگر یہ مسلمان تھے تو ہم نے انہیں کیوں قتل کیا۔ شاید ان کے دلوں میں یہ بات پہلی دفعہ گزری کہ مسلمانوں سے بھی جنگ کی جا سکتی ہے اور انہیں قتل کیا جا سکتا ہے۔ اس سوچ کے مطابق ان کی نگاہوں میں مسلمان کے قتل کی حرمت کم ہو گئی۔ کیونکہ ظہور اسلام کے بعد میدان جنگ میں عرب پہلی دفعہ ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑے ہوئے۔ ان سب باتوں کے باوجود جنگ جمل میں جونہی اہل بصرہ کو شکست ہوئی، کوفہ کے لوگ خوش ہو گئے اور اس فتح نے انہیں جنگ صفین میں شامل ہونے پہ آمادہ کیا۔ جہاں تک جنگ نہروان کا تعلق ہے، اس جنگ میں ایک طرف تو امت سے جدا ہونے والے سب کے سب زاہد اور قرآن مجید کے قاری تھے اور بقول مالک اشتر ان کے ماتھے پر سجدوں کے نشان تھے اور دوسری طرف کوفی، کوفی کو اور بصری بصری کو قتل کر رہا تھا۔ یہی لڑائیاں اس بات کے لیے کافی تھیں کہ ان جاہل لوگوں کے دلوں میں جاہلیت کے زمانے کی یاد از سر نو تازہ کر دیں۔

امام علیؑ فرماتے تھے: ہم رسول اکرمؐ کے ہمرکاب مخالفوں کے مقابلے میں تلوار سونت لیتے تھے اور انہیں قتل کرتے ہیں ہمیں کوئی تذبذب نہیں ہوتا تھا کیونکہ ہم خدائے تعالیٰ کی اطاعت کر رہے ہوتے تھے۔ وہ ایک ایسے مسلمان تھے جو دین کی حقیقت کو سمجھتے تھے اور چاہتے تھے

کہ ان کے اصحاب بھی خود ان کی طرح اس حقیقت کو سمجھیں۔ وہ جانتے تھے کہ ایک اندرونی باغی خلیفہ کی طاقت اور مسلمانوں کے امن و سکون کو نقصان پہنچانے کے سلسلے میں ایک بیرونی حملہ آور سے کچھ کم نہیں ہوتا لیکن ان کے ہمراہی لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے تھے۔

امام علیؑ کے ماتحت کام کرنے والے بیشتر لوگوں نے جب سے ہوش سنبھالا یہی دیکھا تھا کہ اس کا باپ میدان جنگ میں جاتا اور غیر عربوں سے لڑتا ہے۔ جب وہ جنگ سے واپس آتا ہے تو مال غنیمت ساتھ لاتا ہے۔ ان لوگوں میں سے ہر فرد بیگانوں کو قتل کرنے اور غنیمت حاصل کرنے کے علاوہ جنگ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ مرکزی طاقت اور یکجہتی کی قوت کے معنی سمجھنا اس کی بساط سے باہر تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں وہ اسلام سے تعلق رکھنے سے پہلے اپنے قبیلے سے وابستگی رکھتا تھا۔ بلاشبہ امام علیؑ کے سپاہیوں میں ایسے لوگ بھی تھے جو اس وقت کے واقعات کو بخوبی سمجھتے تھے۔ اگر وہ ایسی تشخیص کی قوت نہیں بھی رکھتے تھے تو بھی یہ جانتے تھے کہ اپنے امام کی پیروی کرنی چاہیے۔ تاہم ان کی تعداد دوسرے گروہ کے مقابلے میں بہت تھوڑی تھی اور وہ بھی مجبوراً اپنے پیشوا کی طرح غم زدہ رہتے تھے۔ رسول اکرمؐ کے صحابہ کی سب سے بڑی آرزو یہ ہوا کرتی تھی کہ انہیں میدان جنگ میں بھیجا جائے تاکہ وہ شہادت کا ثواب حاصل کریں۔

جنگ جمل سے پہلے اگر کسی خاندان کا کوئی فرزند میدان جہاد میں مارا جاتا تھا تو اس کے اعزہ گردن اٹھا کر چلتے تھے۔ وہ فخر کرتے تھے کہ انہیں یہ توفیق نصیب ہوئی اور انہوں نے خدا کی راہ میں ایک شہید دیا ہے۔ جنگ احد کے خاتمے پر رسول اکرمؐ نے ایک انصاری عورت کو دیکھا کہ جس کا باپ اور

شوہر جنگ میں مارے گئے تھے۔ جب لوگوں نے اس کے پاس جا کر تعزیت کی تو وہ کہنے لگی: "مجھے یہ بتاؤ کہ رسول اکرمؐ کس حال میں ہیں؟" لوگوں نے جواب دیا: "خدا کا شکر ہے کہ وہ خیریت سے ہیں۔" اس نے کہا: "مجھے یہ بتاؤ کہ وہ کہاں ہیں؟"

جب اس نے آنحضرتؐ کو دیکھا تو کہنے لگی: "اب جب کہ آپ زندہ سلامت ہیں تو ہر مصیبت برداشت کی جا سکتی ہے۔" [1]

لیکن جنگِ جمل کے بعد جب امام علیؑ عبداللہ بن خلف خزاعی کی تعزیت کے لیے اس کے گھر گئے تو گھر کی مالکہ صفیہ بنت حارث عامری خلیفہ کے سامنے کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی: "اے علیؑ! اے دوستوں کے قاتل اور جماعت کو پراگندہ کرنے والے! جس طرح تو نے عبداللہ کے بیٹوں کو یتیم کیا ہے، خدا تیرے فرزندوں کو بھی یتیم کرے۔" [2]

اس عورت نے یہ ہرگز نہ سوچا یا وہ اس بات کو سمجھ ہی نہیں سکتی تھی کہ مسلمانوں کے امامؑ نے جو کچھ کیا اس کے علاوہ ان کے پاس اور کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ کیونکہ انہوں نے طیش کی وجہ سے یا کوئی مرتبہ حاصل کرنے کے لیے اس کے شوہر اور دوسرے لوگوں کو قتل نہیں کیا تھا بلکہ جو کچھ بھی کیا خدائے تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر کیا تھا۔ اس کا شوہر اور دوسرے لوگ جو میدانِ جنگ میں زخمی ہوئے یا کام آئے انہوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے امام کے ساتھ اپنا عہد توڑا بلکہ اسلامی معاشرے کی سلامتی کو بھی خطرے میں ڈال دیا۔ جب وہ نرمی سے سمجھانے کے باوجود بھی راہِ راست کی طرف

---

[1] ابن اثیر جلد ۲ صفحہ ۱۶۳ [2] طبری حوادث سال ۳۶ ہجری

نہیں لوٹتے تو امام علیؑ قرآن مجید کے حکم کے مطابق بزور انہیں مسلمانوں کی جماعت میں واپس لے آئے۔

ہاں تو یہ واحد عورت نہیں تھی جو جنگ کے بعد مسلمانوں کے خلیفہ کے بالمقابل آکھڑی ہوئی اور ناراضگی کا اظہار کیا۔ اس کے علاوہ بھی کئی ایک عورتیں اور مرد ایسے تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ امام علیؑ نے ان پر ظلم کیا ہے۔ تاہم امام علیؑ نے خاص عالی ظرفی کے ساتھ اس عورت کی باتوں کو نظر انداز کر دیا اور اسے کچھ نہ کہا کیونکہ آپ جانتے تھے کہ اسے یہ علم نہیں ہے کہ اس کا شوہر کیوں قتل ہوا ہے۔

جنگ جمل میں کوفہ نے بصرہ کا مقابلہ کیا اور جیسا کہ ہم نے لکھا ہے کوفہ کے لوگوں میں اکثریت یمانیوں کی تھی اور اہل بصرہ کی اکثریت مضریوں پر مشتمل تھی۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ جنگِ جمل میں یمانیوں کا مقابلہ مضریوں سے ہوا تھا۔

تاہم جنگ جمل کے بعد ابھی کچھ زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ جنگ صفین اور اس کے بعد نہروان میں خوارج سے جنگ پیش آئی۔ ان جنگوں میں قبائلی تعصبات ایک اور شکل میں اجاگر ہوئے اور نہ صرف یہ کہ مضری، یمانیوں کے مقابلے پر آ گئے بلکہ مضری اور یمانی، علوی اور عثمانی دو گروہوں میں بٹ گئے اور عثمانیوں کا گروہ علویوں کے مقابلے پر آ کھڑا ہوا۔

بصرے کے یمانی کوفے اور شام کے یمانیوں کے مقابلے پر آ گئے اور شام کے مضری بصرے کے مضریوں کے سامنے ڈٹ گئے۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے، یمانی اور مضری کے مابین نسلی مقابلے میں یمانی حق

پر تھے، کیونکہ وہ قریش کو نسلی تعصب کا ایک ایسا مظہر سمجھتے تھے جو اسلام کو نابود کرنا چاہتا تھا۔ جونہی یمانیوں نے محسوس کیا کہ معاویہ قریش کی مدد سے نئے سرے سے زمانۂ جاہلیت کا نسلی تسلط قائم کرنا چاہتا تھا تو وہ رسول اکرمؐ کے خاندان کی حمایت میں ڈٹ گئے۔ جس طرح مکہ کو فتح کرنے اور قریش کو زیر کرنے کے لیے ان کے آباؤ اجداد نے رسول اکرمؐ کی مدد کی تھی، اسی طرح ان کے فرزند بھی حضرت علیؑ کے پہلو میں کھڑے ہو گئے۔ تاکہ وہ معاویہ کو زیر کرلیں۔ جنگ صفین جسے یمانیوں (انصار) اور قریش (مہاجرین) کے درمیان جنگ کا نام دیا گیا ہے۔ اس میں ایک یمانی مرد نے لڑائی کے دوران کہا:

"اے لوگو! تم میں سے کون ہے جو خدا کی رضا کی خاطر نیزوں کے نیچے جانے کو تیار ہو؟ مجھے اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ آج ہم تمہارے (قریش کے) خلاف قرآن کی تاویل کی خاطر لڑ رہے ہیں، جیسا کہ پہلے اس کی تنزیل کی خاطر لڑتے تھے۔" جنگِ صفین میں یمانیوں کے مقابل وہی لوگ تھے جن سے وہ عہد رسالت میں لڑ چکے تھے۔ اس لیے وہ اس جنگ میں بھی خاصے پرجوش ہو کر حصہ لے رہے تھے۔

پھر جوں جوں یہ جنگ لمبی ہوتی سپاہیوں کی تھکن اور مایوسی بھی نمایاں ہوتی گئی، حتیٰ کہ ان میں سے بیشتر اشخاص رفتہ رفتہ حضرت علیؑ سے خفا ہو گئے۔ کیونکہ بدقسمتی سے ان کی اکثریت آپ کی قوی اور درست منطق کو نہیں سمجھ سکتی تھی۔ اس خفگی کے آثار ہم امامؑ کے ان شکایت آمیز خطبوں میں دیکھتے ہیں جو انہوں نے جنگِ صفین کے بعد دیے۔ جنگ کے

میدانوں میں عربوں کی عربوں سے لڑائی نے جہاد کا شوق لوگوں کے دماغوں سے نکال دیا۔ قرآن مجید میں ہم ایک آیت دیکھتے ہیں جو جنگِ تبوک کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ [۱]

مسلمانوں کے پاس اس جنگ میں شریک ہونے کے لیے ساز و سامان کافی نہ تھا۔ کچھ لوگ رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ انہیں ہتھیار وغیرہ مہیا کیے جائیں، تاکہ وہ میدانِ جنگ میں جائیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ تب وہ لوگ روتے ہوئے آپ کے پاس سے چلے گئے۔

۱۲ھ میں جب ابوبکر بن قحافہ نے خالد بن ولید کو عراق پر حملے کے لیے نامزد کیا تو اس کے لیے بڑی قلیل مدت میں سترہ ہزار سپاہی اکٹھے ہو گئے لیکن ابھی اس واقعے کو چوتھائی صدی کا عرصہ بھی نہیں گزرا تھا اور ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے امام علیؑ لوگوں کو معاویہ جیسے غاصب کے خلاف جہاد کرنے کی جتنی بھی دعوت دیتے یا ان سے کہتے کہ کم از کم شام کے غارتگروں کے عراق پر حملوں کو روکنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں، وہ ان کی بات پر کان نہیں دھرتے تھے۔

ادھر جب معاویہ نے بُسر بن ارطاۃ کو عراق اور حجاز کے علاقوں میں بھیجا تو اسے کہا: "تم ایسے کسی بھی شخص کو دیکھو جو علیؑ کا دوستدار ہو اسے قتل کر دو، حتیٰ کہ عورتوں اور بچوں کو بھی نہ چھوڑو۔ بُسر مکہ اور یمن گیا اور ان شہروں کو جلا کر تباہ و برباد اور لوگوں کو تہ تیغ کر دیا۔ جب وہ یمن پہنچا

---

[۱] سورۂ توبہ - آیت ۹۲

تو امام علیؑ کا عامل عبید اللہ بن عباس وہاں سے فرار ہو چکا تھا۔ تاہم بُسر نے اس کے دو کمسن بچوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کر دیا۔[1] بعض مؤرخین نے کہا ہے کہ یہ لڑکے بنی کنانہ کے ایک آدمی کے پاس صحرا میں تھے۔ جب بُسر نے انہیں قتل کرنا چاہا تو اس شخص نے کہا: اگر تم ان بے گناہ بچوں کو قتل کرنا چاہتے ہو تو پہلے مجھے قتل کرو۔ تب ظالم بُسر نے اسے بھی قتل کر دیا۔

بنی کنانہ کی ایک عورت نے فریاد کرتے ہوئے کہا: "اے ارطاۃ کے بیٹے! تو نے مردوں کو قتل کیا! تو نے کمسن بچوں کو قتل کیا۔ ایسے قتلِ عام کی مثال جاہلیت اور اسلام دونوں میں نہیں ملتی۔ جو حکومت بچوں اور بوڑھوں کو قتل کر کے قائم کی جائے وہ بُری حکومت ہے۔[2]

امام علیؑ کہ جن کے موافق و مخالف سبھی ان کی پارسائی اور عدالت کے معترف ہیں، جب ان کی حکومت میں خدا کے دشمنوں کے خلاف جہاد کی صورت یہ ہو جائے کہ عبد اللہ ابن خلف کی بیوی ان کے رو در رو یوں بے ادبانہ بلکہ گستاخانہ باتیں کرے اور آپ کے حکم سے باہر ہو جائے، نیز معاویہ کے فوجی دستے امام علیؑ کے ماتحت علاقوں میں یوں لوٹ مار مچائیں اور آپ کے اصحاب انہیں مار بھگانے میں اپنے امامؑ کی کوئی مدد نہ کریں۔ پس اگر ہم یہ کہیں کہ ان پچاس سالوں کے آخری حصے میں جزیرۂ عرب کی اندرونی جنگوں میں دین کا رنگ باقی نہیں رہا تھا اور ان پر عربی اور

---

[1] اغانی جلد ۱۵ صفحہ ۴۴۔ تاریخ تمدن اسلامی جلد ۴ صفحہ ۸۲۔ تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۱۷۴۔
[2] ابن اثیر جلد ۳ صفحہ ۱۹۱ و ۲۱۱۔ تاریخ تمدن اسلامی جلد ۴ صفحہ ۷۳۔

قبائلی رنگ چڑھ گیا تھا تو یہ کوئی بیجا بات نہ ہو گی۔
مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ وہ لوگ جو امام حسین ؑ کو قتل کرنے پر آمادہ تھے، آپ نے ان سے پوچھا: جب میں نے تمہارے کسی آدمی کو قتل نہیں کیا اور نہ ہی خدا کے دین میں کوئی تبدیلی کی ہے تو پھر کیوں تم مجھے قتل کرنے کے درپے ہو؟ انہوں نے جواب دیا: اس کی وجہ وہ بغض ہے جو ہم تمہارے باپ کے لیے اپنے دلوں میں رکھتے ہیں۔ اگرچہ ان کے یہ جملے قدیم تاریخ نویسوں نے نہیں لکھے لیکن ان کے بعد کی کتب مقاتل میں دیکھنے میں آتے ہیں اور ان باتوں کا کہا جانا خاصا ممکن معلوم ہوتا ہے۔ گویا کہ پچاس سال گزرتے گزرتے ایک طرف تو اسلامی اخوت کو بھلا دیا گیا اور دوسری طرف طیش اور انتقام کا وہ جذبہ جو جنگ کے میدان میں خدا کی راہ میں جہاد کی شکل میں ظاہر ہوتا تھا، اب وہ قبائلی دشمنی اور خونخواہی کی صورت میں تبدیل ہو گیا۔ یہاں تک کہ قبیلہ ہمدان بمقابلہ عک یا قبیلہ کندہ بمقابلہ مذحج کھڑا ہو گیا اور پھر قحطانیوں کی حمایت کرنیوالے لوگ عدنانیوں کے خلاف یا اموی جنگ باز —— ہاشمیوں سے انتقام لینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

قریش اور جاہلی امتیازات

اَلنَّاسُ عَبِیْدُ الدُّنیا وَالدِّیْنُ لَعِقٌ عَلیٰ اَلْسِنَتِہِمْ
یَحُوطُونَہُ مَادَرَّتْ بِہٖ مَعَائِشُہُمْ [1]

لوگ دنیا کے بندے ہیں، وہ دین کا نام اس لیے لیتے ہیں کہ اس کے ذریعے اپنی دنیا بنالیں۔ (حسینؑ بن علیؑ)

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، اہل مکہ کے ایک گروہ نے اسلام قبول کر لیا اور اس کی تعداد کچھ زیادہ نہیں تھی۔ ان میں سے کچھ لوگ قریش کے سرداروں کے ظلم سے نجات پانے کے لیے حبشہ روانہ ہو گئے اور جو باقی رہ گئے وہ بھی آخر کار مدینہ چلے گئے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے سچے دل سے اسلام قبول کیا اور انہوں نے خدا و رسولؐ کی رضا کے لیے ہر تکلیف برداشت کی تھی۔ اہل مدینہ میں سے بھی خواہ وہ اشخاص کہ جنہوں نے

پہلی اور دوسری بیعت عقبہ میں پیمان باندھا تھا اور خواہ وہ تھے جو مہاجرین کو اپنے گھروں میں لے گئے تھے ــــــ بہت بڑی تعداد میں رسول اللہؐ پر ایمان لے آئے اور انہیں خدا کا پیغمبر سمجھتے تھے۔ ان لوگوں سے جہاں تک بھی ہو سکا، انہوں نے خدا کے دین کی پیشرفت کے لیے کوشش کی اور اس کی خاطر قربانیاں دیں لیکن مدینے کے اردگرد رہنے والے وہ بدو قبیلے جو فتح مکہ اور رسول اکرمؐ کی رحلت کے بعد مسلمانوں کی فاتحانہ جنگوں کے دوران میں مسلمان ہوئے تھے ان کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ بھی ایمان کے اسی رتبے پر فائز ہیں جو ان مہاجرین اور انصار کا ہے، جنہوں نے مشکل وقت میں دین کی حمایت کی تھی۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جسے اس زمانے کے مسلمان بھی جانتے تھے اور قرآن اور سنت میں بھی اس کی تائید پائی جاتی ہے۔ بیشتر صحرانشینوں کا اسلام اپنے قبیلے کے رئیس کے اسلام کے تابع تھا اور پھر بہت سے رؤسا کا اسلام بھی ان کے خوف اور طمع کا نتیجہ تھا۔ یعنی کچھ شیوخ تو تلوار کے خوف سے اسلام لائے اور چند ایک فوج کی سالاری اور مال غنیمت کے لالچ میں اپنے آپ کو مسلمان کہنے لگے۔ تاہم جب وہ ظاہر طور پر مسلمان ہو گئے تو رسول اکرمؐ نے ان کے ساتھ مسلمانوں جیسا ہی سلوک کیا، یعنی جونہی انہوں نے کلمۂ توحید پڑھا ان کا خون اور مال محترم گردانا گیا لیکن قرآن مجید اور اسی طرح سنت پیغمبرؐ کے ذریعے انہیں تنبیہ اور بعض اوقات تہدید کے ساتھ خبردار کیا گیا۔[1]

---

[1] اس کتاب کے صفحہ ۵۰ کی سطر ۱ تا ۶ ملاحظہ ہو۔

رسول اکرمؐ ان لوگوں میں سے بیشتر کے دلوں کی حالت کو جانتے تھے، لیکن آپ ان کی حرمت کا پردہ چاک نہیں کرنا چاہتے تھے۔ تاہم کبھی کبھی وحی کی زبان سے کہہ دیا جاتا تھا کہ جو کچھ ان ریاکار لوگوں کے دلوں میں ہے، خدا اور اس کا رسولؐ اس سے واقف ہیں اور وہ یہ نہ سمجھیں کہ وہ حضرت محمدؐ کو دھوکا دے رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کو خبردار کیا جاتا تھا کہ وہ ان لوگوں سے بچ کر رہیں اور انہیں اپنا دوست تصور نہ کریں۔

وہ لوگ جو تمہارے انجام کار کے منتظر ہیں کہ دیکھیں فتح ہوتی ہے یا شکست، پس اگر خدا کی طرف سے تمہیں فتح ہوئی تو کہنے لگے کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ اگر فتح کافروں کو حاصل ہوئی تو ان سے کہتے ہیں کہ کیا ہم تم پر غالب نہ آگئے تھے اور تم کو مومنین کے ہاتھوں سے ہم نے بچایا نہیں تھا؟

(سورۂ نساء۔ آیت ۱۴۱)

شہر مکہ کے بہت سے سردار بھی نہ دل سے مسلمان نہیں ہوئے۔ جس رات انصار مدینہ مکہ کے نزدیک پہنچے، رسول اکرمؐ کے چچا عباسؓ لشکرگاہ سے باہر آئے اور کسی اچھے پیامی کی جستجو میں مصروف ہو گئے۔ وہ چاہتے تھے کہ آنحضرتؐ کے مکہ میں داخل ہونے سے پہلے شہر کے لوگوں کو اطلاع دے دیں تاکہ وہ کوئی اچھی تدبیر سوچیں اور اطاعت قبول کریں۔ چنانچہ اس رات ان کی ملاقات رسول اکرمؐ کے جانی دشمن ابوسفیان سے ہو گئی، تب حضرت عباسؓ نے اسے پناہ دی اور آنحضرتؐ کی خدمت میں لے گئے۔ پھر اسے یہ یاد کرانے کے لیے کہ اب اس کے لیے اطاعت

قبول کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں، حضرت عباس رضؓ نے اسے ایک ایسی جگہ بٹھایا، جہاں اسلام کے سپاہی اس کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ اس وقت ابوسفیان نے حضرت عباس رضؓ سے کہا: "تمہارے بھتیجے کی بادشاہی بہت بڑی ہو گئی ہے۔" حضرت عباس رضؓ نے اسے سمجھایا کہ لفظ "بادشاہی" کا استعمال درست نہیں، کیونکہ یہ پیغمبری کی شان ہے۔[1]

ابوسفیان نے بھی بظاہر اس بات کو تسلیم کر لیا لیکن جو کچھ وہ زبان سے کہہ رہا تھا، آیا اس کے دل میں بھی وہی کچھ تھا یا نہیں؟ جیسا کہ رسول اکرم ﷺ کی وفات کے بعد اس کا رویہ کسی حد تک اس حقیقت کی نشان دہی کرتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ بہر حال فتح مکہ کے بعد قریش نے اطاعت قبول کر لی۔ جس دن شہر فتح ہوا، بنی امیہ کے سردار ابوسفیان کا گھر پناہ گاہ قرار دیا گیا۔

جیسا کہ معلوم ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی وفات کے بعد اس خاندان نے اعلیٰ ترین اختیارات حاصل کر لیے اور مسلمانوں کی پیشوائی کا منصب قریش کے لیے مخصوص ہو گیا۔ ابوبکر بن قحافہ کے مختصر دور میں خود اس کی اور دیگر سربرآوردہ اصحاب کی توجہات باغیوں اور اہل ردہ کی سرکوبی پر مرکوز رہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش اور دوسرے سرداروں کو جو کسی امید کی بنا پر مسلمان ہوئے تھے، کھل کھیلنے کا موقع نہ ملا۔ وہ مجبوراً خلیفہ اور اس کے مشیروں سے تعاون کرتے رہے، تاکہ اس نو تعمیر شدہ عمارت کو گرنے سے بچایا جا سکے۔ ان دنوں چونکہ حکومت نے اپنے نظم و نسق کی سادگی برقرار رکھی تھی یا یوں

---

[1] ابن ہشام جلد ۴ صفحہ ۲۰ تا ۲۳

کہا جائے، جیساکہ ہم آئندہ باب میں دیکھیں گے کہ ابھی تک کثیر رقوم بیت المال میں نہیں پہنچی تھیں جن سے حرص کو بڑھاوا ملتا۔ اس لیے جہاں تک ہو سکا وہ پوری مضبوطی کے ساتھ مسلمانوں کی وحدت ملی کی حفاظت اور مرکز خلافت کی تقویت کے راستے پر جمے رہے۔

اصل میں خطرے کے آثار عمر بن خطاب کے زمانے میں ظاہر ہوئے۔ اس وقت اسلام کے سپاہی جزیرہ نما کی سرحدوں سے آگے بڑھے اور انھوں نے ایران اور روم کی سلطنتوں کا خاتمہ کر دیا اور اس کے ساتھ ہی مصر کو بھی فتح کر لیا۔ ان فتوحات نے جہاں اسلام کو عربی ماحول سے آگے بڑھا کر اس کا آفاقی ہونا ثابت کر دیا، وہاں ان سے اسلامی معاشرے کو نقصان بھی پہنچا۔ اگرچہ شروع میں تو یہ نقصان چنداں محسوس نہیں ہوا لیکن بمشکل چند سال گزرے ہوں گے کہ خلیفۂ وقت کو خطرے کا احساس ہو گیا۔

صدرِ اسلام میں مسلمانوں کو جو سب سے بڑا نقصان پہنچا وہ قبیلۂ قریش کا ایک امتیازی حیثیت حاصل کر لینا تھا۔ جیساکہ ہم آئندہ ابواب میں تفصیل سے بیان کریں گے۔ قریش نے زمانۂ جاہلیت میں اپنے لیے کچھ امتیازات پیدا کر لیے تھے۔ یعنی خانۂ کعبہ کی حفاظت اور زائرین کی دیکھ بھال ان کے ذمے تھی۔ اس لیے وہ اپنے آپ کو ایک قسم کی روحانی بزرگی کا حامل سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب حاجی عرفات سے روانہ ہوتے تو قریش مزدلفہ سے کوچ کی تیاری کرتے تھے۔ وہ اس جگہ سے روانہ نہیں ہوتے تھے جہاں سے دوسرے لوگ روانہ ہوتے تھے۔

اس کے علاوہ عام لوگوں کا اعتقاد تھا کہ خانہ کعبہ کا طواف پاک لباس

ہیں کرنا چاہیے لیکن لباس کو اس وقت پاک سمجھا جاتا تھا، جب وہ قریش کے کسی خاندان سے لیا گیا ہو۔ اب اگر یہ قبیلہ حسد یا بخل کی بنا پر کسی کو لباس نہیں دیتا تھا تو مجبوراً اسے برہنہ ہو کر خانۂ کعبہ کا طواف کرنا پڑتا تھا۔[1]

ظہورِ اسلام کے بعد یہ اور ایسے ہی دوسرے امتیازات مٹ گئے اور لوگوں نے دیکھا کہ رسول اکرمؐ جو خود قریش سے ہیں، وہ اپنے آپ کو دوسرے لوگوں جیسا ہی سمجھتے ہیں۔ اگرچہ قبائلی سرداروں کو یہ چیز مجبوراً برداشت کرنی پڑتی تھی لیکن خود پسند اور "متکبر" قریش نے مساوات کا اصول تسلیم نہ کیا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں رسول اکرمؐ کی وفات کے بعد قریش نے مسلمانوں کا مقدر اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنا پہلا امتیاز پھر حاصل کر لیا۔

عمر بن خطاب نے وظائف کا محکمہ قائم کیا اور مسلمانوں کی اسلام میں سبقت کے لحاظ سے ان کے لیے وظیفے مقرر کیے اور پھر مفتوحہ علاقوں کی زمینیں بھی فاتح سپاہیوں میں تقسیم کر دی گئیں۔ تب وہ طبقہ کہ جو ایام جاہلیت سے سوداگری میں ماہر تھا اس نے عہد اسلام میں دولت ہاتھ آتے ہی اپنی پہلی روش کو اپنا لیا۔

عمر بن خطاب کو ان کی کیفیت کا بخوبی علم تھا، اس لیے جہاں تک ہو سکا ان کو اپنی نگرانی میں رکھا۔ چنانچہ جب کبھی کوئی مہاجر خلیفہ کے پاس آتا اور جہاد میں شریک ہونے کے لیے اجازت طلب کرتا تو عمر بن خطاب کہتے: "تمہارے لیے اس سے بہتر کوئی چیز نہیں کہ تم گھر میں بیٹھ رہو، تاکہ نہ تم دنیا کو دیکھو اور نہ دنیا تمہیں دیکھے لیکن جب خلافت عثمان بن عفان کو ملی تو یہ لوگ مختلف شہروں میں پھیل گئے۔ جہاں ان کا میل جول غیر عرب قوموں سے ہوا اور وہ ایک ایسی زندگی سے دوچار ہوئے جو اس سے

---

[1] ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۲۱۹

مختلف تھی جس کے وہ عادی تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ ان کے اندر رسول اکرمؐ، ابوبکر بن قحافہ اور عمر بن خطاب کے زمانے کی اسلامی نظم و ضبط کی روح کمزور ہو گئی۔ حتیٰ کہ ان میں سے بعض یہ کوشش بھی کرتے تھے کہ اپنے فائدے کی خاطر اسلامی احکام پر عمل درآمد روک دیں۔ مثلاً قصاص جو اسلام کے صریح احکام میں سے ہے اور قرآن مجید میں آیا ہے:

"وَلَكُمْ .... يَا أُولِي الْأَلْبَابِ"

(بقرہ - آیت ۱۷۹)

قصاص کے لزوم کی تائید ان واقعات سے بھی ہوتی ہے:

۱۔ رسول اکرمؐ اپنی زندگی کے آخری ایام میں منبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا:

"اے لوگو! اب وقت ہے کہ تم میں سے جس کسی کا مجھ پر حق ہو وہ لے لے۔ اگر میں نے تم میں سے کسی کی کمر پہ تازیانہ مارا ہے تو یہ رہی میری کمر۔ وہ بھی تازیانہ مار لے۔ اگر میں نے تم میں سے کسی کی بے آبروئی کی ہے تو وہ بھی آئے اور مجھ سے قصاص لے لے۔" [۱]

۲۔ جب عمر بن خطاب نے شام کا سفر کیا تو اس دوران میں ایک شخص نے ان کے پاس آکر یہ شکایت کی کہ ایک حاکم نے اسے ناحق مارا ہے۔ جب حاکم کی زیادتی ثابت ہو گئی تو خلیفہ نے کہا:

"مظلوم کو چاہیے کہ ظالم سے قصاص لے۔"

---

[۱] طبری حوادث سال یازدہم۔

ان کے کچھ مصاحبین نے درخواست کی کہ حاکم کو قصاص سے معاف رکھا جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ قصاص لینے سے حاکم کے رعب میں کمی آجائے گی اور رعیت اس پر حاوی ہو جائے گی۔ عمر بن خطاب نے ان کا کہنا نہیں مانا اور کہا: "میں نے رسول اکرمؐ کو دیکھا ہے کہ خود اپنی ذات سے قصاص دلاتے تھے۔"

۳۔۔۔۔ تاہم عبیداللہ ابن عمر نے ہرمزان اور جفینہ کو اپنے باپ کے قتل کی سازش میں شرکت کے الزام پر مار ڈالا۔ جب مخلص مسلمانوں نے اصرار کیا کہ عبیداللہ سے ان مقتولین کا قصاص لیا جائے تو قریش نے کہا: "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کل تو اس کا باپ قتل کر دیا گیا اور آج بیٹے کو مار ڈالا جائے؟" چنانچہ عثمان بن عفان نے عمرو بن عاص کے مشورے سے عبیداللہ کی سزائے قتل معاف کر دی۔ زیاد بن لبید نے اس مضمون کے اشعار کہے تھے کہ:

"عبیداللہ کو ہرمزان کے قتل کے بدلے قتل کر دینا چاہیے۔
اگر تو نے اسے بخش دیا ہے تو یہ بخشش بے جا ہے۔"

عثمان نے اس شاعر کو سخت اذیت دی تاکہ وہ آئندہ ایسے اشعار نہ کہے۔

بہت سے انصار و مہاجرین کے حالاتِ زندگی کی تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ ان لوگوں نے اسلام کی راہ میں سختیاں سہیں اور تکلیفیں برداشت کیں اور قرآن مجید جگہ جگہ ان کے لیے خدا اور اس کے رسولؐ کی خوشنودی کا اعلان کرتا ہے۔ نیز ان کی فضیلت کا اظہار کر کے ان کے لیے ایک طرح کا امتیاز تسلیم کرتا ہے لیکن خود انہوں نے اپنے آپ کو کبھی بھی دوسروں سے برتر نہیں جانا اور وہ چاہتے تھے کہ انہیں بھی دوسرے مسلمانوں کے برابر سمجھا جائے۔ ان کی یہی فروتنی تھی کہ جس سے رسول اکرمؐ کے دل میں ان کی

قدر و منزلت بڑھ گئی لیکن جب آنحضرت ؐ نے رحلت فرمائی اور ابوبکر بن قحافہ نے اعلان کیا کہ یہ لازم ہے کہ مسلمانوں کا پیشوا قریش میں سے ہو۔ پھر عمر بن خطاب کے زمانے میں وظائف مقرر کرتے وقت ادائیگی کا اونچا درجہ اس طبقے کے لیے مقرر کر دیا گیا۔ جب کثیر دولت ان کے سپرد کر دی گئی تو روحانی سرداری، دنیاوی سرداری کے ساتھ مخلوط ہو گئی اور رفتہ رفتہ اسلامی مساوات کا اصول ناپید ہو گیا۔ حتیٰ کہ عثمان کی خلافت کے آخری دور میں نہ صرف یہ کہ اعلیٰ سرکاری عہدے حاصل کرنے میں انہوں نے غیر قریش پر برتری حاصل کر لی، بلکہ عربوں کو ان دوسری نسلوں کے لوگوں پر برتر گردانے کی داغ بیل بھی پڑ گئی جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ہوتے ہوتے معاویہ کے زمانے میں قریش نے کھل کر برتری جتانی شروع کر دی۔ جہاں تک ہو سکتا تھا معاویہ اور ان کے عامل موالیوں کی تذلیل سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے عرب نسل کو غیر عربوں سے بہتر قرار دے کر اسلام کے اصولوں میں سے ایک اور اصول نظر انداز کر دیا وہ اسلامی معاشرہ کہ جس کی بنیاد مساوات پر رکھی گئی تھی، وہ اسلام سے پیشتر کے زمانے سے زیادہ قریب ہو گیا اور نسب کو ہر دوسرے وصف سے زیادہ اہمیت دی جانے لگی تھی۔

مسلمانوں میں سرمایہ دار طبقہ کا ظہور

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰہُ الرِّزْقَ لِعِبَادِہٖ لَبَغَوْا فِی الْاَرْضِ

اور اگر خدا اپنے بندوں کی روزی میں فراخی کر دے تو وہ
لوگ ضرور زمین میں سرکشی کرنے لگیں۔ (شوریٰ۔ آیت ۲۶)

جس سال رسول اکرمؐ نے مکہ سے ہجرت فرمائی اور مدینہ کو دین اسلام کی اشاعت کا مرکز بنایا، وہ مسلمان جنہوں نے آنحضرتؐ سے پہلے یا آپ کے بعد اس شہر میں ہجرت کی ان میں سے اکثر تہی دست تھے۔ ان دنوں اسلام کے پاس نہ تو کوئی ذریعہ آمدنی تھا نہ تحصیل زر کا نظام اور نہ بیت المال ہی تھا کہ جہاں سے تہی دست مہاجرین کی ضروریات زندگی پوری کی جاتیں۔ یہ مہمان لوگ کہ جن کے پاس نہ تو رہنے کی جگہ تھی اور نہ ہی کوئی مال و دولت تھا۔ انصار یعنی مدینہ کے مسلمان ان کو اپنے گھروں میں لے گئے اور انہیں بھی اپنی زندگی میں شریک کر لیا۔ نیز اصحاب صفہ کی تہی دستی اور ان کی

گزر اوقات کے بارے میں سبھی جانتے ہیں، لہٰذا اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سے اگلے برسوں میں مختلف جھڑپوں اور باقاعدہ جنگوں میں ان مسلم مجاہدوں کو غنیمت کے طور پر تھوڑا بہت مال یا کچھ چارپائے نصیب ہوئے۔ اس آمدنی کے قلیل ہونے کے باوجود اس سے ان کے وسائل زندگی میں وسعت ضرور پیدا ہو گئی لیکن یہ آمدنی اتنی نہیں تھی کہ ان کے اخراجات پورے کرتی۔ اسی دوران میں ہجرت کے دوسرے سال زکات فطرہ ادا کرنے کا حکم آیا۔ تاہم یہ آمدنی چونکہ سال بھر میں ایک مرتبہ ہوتی تھی اور اس کی مقدار بھی بے حد قلیل تھی، لہٰذا ماننا پڑتا ہے کہ اس نے ان حاجتمندوں کی زندگی کو بہتر بنانے میں کوئی نمایاں کردار ادا نہیں کیا۔ پھر ہجرت کے پانچویں سال کے بعد کی جنگوں میں ان کی آمدنی کسی حد تک بڑھ گئی اور مجاہدین کو مال غنیمت میں سے زیادہ حصہ ملنے لگا۔ لیکن وہ اتنا زیادہ بھی نہیں تھا کہ ان کی زندگی کے اخراجات پورے کرنے کے لیے کافی ہو۔

"صدقات" کو ہجرت کے نویں سال میں شرعی حیثیت حاصل ہوئی اور رسول اکرمؐ نے ان کی وصولیابی کے لیے اپنے عاملوں کو مختلف قبیلوں کے پاس بھیجا۔ مگر افسوس ہے کہ تاریخ میں رسول اکرمؐ کے زمانے کی صحیح صحیح آمدنی نہیں لکھی گئی۔ پھر بھی کتب اموال میں دیے گئے مختصر اشاروں سے پتا چلتا ہے کہ یہ آمدنی کچھ زیادہ نہیں تھی اور آنحضرتؐ کے زمانے میں جو زیادہ سے زیادہ رقم موجود رہی۔ اس کا اندازہ اونٹوں اور گھوڑوں کے علاوہ چالیس ہزار درہم لگایا گیا ہے۔[1]

---

[1] تاریخ تمدن اسلام جلد ۲ صفحہ ۱۰

عمر بن خطاب کے زمانے میں ایران، روم اور مصر کے مقبوضات فتح ہونے کے بعد مسلمانوں کی آمدنی اچانک بڑھ گئی۔ اس قدر دولت آجانے سے خلیفہ عمر کو فکر لاحق ہوئی کہ اب کیا کرے؟ آیا سارا مال مسلمانوں میں بانٹ دے یا اس کو ان میں قسط وار تقسیم کرے۔ پھر انہوں نے صحابہ سے مشورہ کرنے کے بعد ایک طرح کا نظام مالیات تیار کیا۔ جس کے مطابق ہر مسلمان کا نام رجسٹر میں درج کیا گیا اور اس کی اسلام لانے میں سبقت یا رسول اللہؐ سے قربت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا وظیفہ مقرر کر دیا گیا۔

زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ چند بزرگ صحابہ اپنی اسی آمدنی کے ساتھ تجارت اور مضاربہ میں مشغول ہو گئے اور انہوں نے اس ذریعے سے بے شمار دولت جمع کر لی۔ اس کے ساتھ ساتھ انہیں مال غنیمت سے بھی بیشتر حصہ ملتا تھا۔ جس کی آمد روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام میں ایک نیا طبقہ پیدا ہو گیا۔ جس میں روحانی اور مادی اشرافیت یکجا ہو گئی۔ خلیفہ عمر نے نظام وظائف کو تشکیل دینے کے بعد جہاں تک ہو سکا یہ کوشش کی کہ ان لوگوں کو مکان اور زرعی زمین خریدنے سے باز رکھیں کیونکہ انہیں ڈر تھا کہ انہیں دولت جمع کرنے کی لت پڑ جائے گی اور یہ بدعنوان ہو جائیں گے۔ تاہم قریش اس بات کو نہیں بھولے تھے کہ اسلام سے پہلے وہ ساری دنیا کی تجارت کے اجارہ دار تھے جو ایشیا اور یورپ کے درمیان ہوا کرتی تھی اور انہوں نے اس ذریعے سے نہ صرف بہت سی دولت کمائی تھی بلکہ اس سے بھی بڑھ کر استثمار کا وسیع تجربہ حاصل کر لیا تھا۔ عمر بن خطاب کی کوشش یہ تھی کو وہ ان لوگوں کو مدینہ ہی میں رہنے کا پابند رکھیں۔ علاوہ ازیں وہ یہ احتیاط بھی کرتے تھے کہ اس گروہ کے

سربرآوردہ اشخاص کو کسی اہم کام کی ذمہ داری نہ دیں، جیسا کہ تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ انہوں نے ان میں سے فقط چند ایک ہی کو بڑے شہروں کا والی مقرر کیا۔ جب خلیفہ عمر کسی کو کسی شہر کا حاکم بنا کر بھیجتے تو حکم دیتے کہ اس کی املاک کی فہرست تیار کر لی جائے۔ پھر کچھ مدت کے بعد بھی اس کی جائداد کی جانچ پڑتال کی جاتی تھی۔ چنانچہ مؤرخین نے لکھا ہے کہ جب خلیفہ عمر نے بحرین کے حاکم ابوہریرہ کے مال و متاع کی جانچ پڑتال کی تو معلوم ہوا کہ اس نے بہت سی دولت جمع کر لی ہے۔ تب انہوں نے ابوہریرہ سے کہا: جس دن میں تمہیں بحرین بھیج رہا تھا، اس دن تیرے پاس اپنے جوتے کے علاوہ کچھ نہ تھا اور اب میں نے سنا ہے کہ تم نے چند گھوڑے ایک ہزار چھ سو دینار میں خریدے ہیں۔ پس مجھے بتاؤ کہ یہ رقم تمہارے پاس کہاں سے آئی؟ ابوہریرہ نے بازپرس سے بچنے کے لیے کہا: میرے پاس کچھ گھوڑیاں تھیں کہ جنہوں نے بچے دیے اور میرے پاس چند رقم بھی تھی جس سے مجھے منافع حاصل ہوا ہے۔ عمر بن خطاب نے کہا: "جب ہم تمہارے اخراجات بیت المال سے ادا کرتے ہیں تو یہ رقم تمہارے لیے فالتو ہے۔" پھر اس نے وہ مال ابوہریرہ سے لے کر بیت المال میں جمع کر دیا۔

چنانچہ رسول اکرمؐ کی وفات سے لے کر عثمان کی خلافت کے چند سالوں تک جبکہ اسلامی معاشرے پر ابھی دینی احکام کا راج تھا، کبھی کبھی خلیفہ یا اسلام کی اہم شخصیتوں کی جانب سے دولت جمع کرنے والوں کو تنبیہ کی جاتی تھی جو اکثر مؤثر ثابت ہوتی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ ایک دن عبدالرحمٰن بن عوف کا کاروان تجارت واپس مدینہ پہنچا جو اتنا بڑا تھا کہ شہر میں غل مچ گیا۔ تب بی بی عائشہ نے

پوچھا: کیا بات ہے؟ انہیں بتایا گیا کہ عبدالرحمٰن بن عوف کے اونٹ شہر میں پہنچے ہیں! بی بی عائشہ نے کہا: میں نے رسول اکرمؐ سے سنا کہ آپ نے فرمایا: عبدالرحمن بن عوف صراط پر گرتا پڑتا جا رہا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوزخ میں گر جائے گا۔ جب یہ خبر عبدالرحمٰن بن عوف تک پہنچی تو انہوں نے کہا: میں یہ اونٹ اور جو کچھ ان پر لدا ہوا ہے خدا کی راہ میں دیتا ہوں، جبکہ ان اونٹوں کی تعداد پانچ سو تھی۔[1]

اسی طرح لکھا گیا ہے کہ ایک دن کچھ مال خلیفہ عمر کے پاس لایا گیا اور انہوں نے اسے بانٹنا شروع کیا۔ اس وقت سعد بن ابی وقاص لوگوں کی صف چیرتے ہوئے خلیفہ کے پاس جا پہنچے۔ عمر بن خطاب نے اپنا تازیانہ سعد کے سر پہ بلند کیا اور کہا: تمہارا آگے آنا اس بات کی نشانی ہے کہ تم زمین پہ خدا کی حکومت سے نہیں ڈرتے اور میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ خدا کی حکومت بھی تم سے نہیں ڈرتی۔[2]

اس طرح خلیفہ عمر نے جو سخت مالی پالیسی اختیار کی وہ قریش کو ناگوار گزری اور آخر کار وہ ایک سازش کے نتیجے میں مارے گئے جو ظاہراً طور پر اس مالدار گروہ کے چند سرداروں نے ترتیب دی تھی۔ افسوس ہے کہ عمر بن خطاب کی زندگی کا یہ حصہ ابہام کے ایسے پردے سے ڈھکا ہوا ہے کہ جسے اٹھانا یہاں ممکن نہیں۔

خلیفہ عمر کے قتل ہو جانے کے بعد دولت جمع کرنے والے اشراف کے کندھوں پر سے ایک سنگین بوجھ اتر گیا اور ان کا سکون خاطر اس

---

[1]، [2] ابن سعد۔ طبقات جلد ۳ باب ۱

وقت کمال کو پہنچ گیا جب عمر بن خطاب کے بعد عثمان بن عفان مسلمانوں کے خلیفہ بنے۔ خلیفہ عثمان کی مالی پالیسی نے قریش اور غیر قریش کو مسلمانوں کے مال پر دست اندازی کے معاملے میں خاصا دلیر کر دیا۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ وظائف میں اضافہ کیا بلکہ پہلی بار دوسرے شہروں کے لوگوں کو اپنے پاس بلایا اور انہیں انعامات دیے، جبکہ اس عمل کی اس سے پہلے کوئی مثال نہ تھی۔ لوگوں کو زیادہ وظائف اور خاص انعامات دینے کے علاوہ انہوں نے یہ حکم بھی دیا کہ ماہ رمضان میں طعام خانے کھول دیے جائیں تاکہ وہاں مسافر اور حاجتمند لوگ کھانا کھا سکیں۔[1] اگرچہ حاجتمندوں کو کھانا کھلانا ایک اچھا عمل ہے ۔۔۔۔ خواہ وہ بیت المال کی جانب سے ہی کیوں نہ ہو، لیکن جیسا کہ ڈاکٹر طہٰ حسین نے کہا ہے کہ اس بات کی کون ضمانت دے سکتا ہے کہ جو لوگ ان طعام خانوں میں آ بیٹھتے تھے، وہ سبھی کے سبھی حاجتمند ہی ہوتے تھے۔[2]

خلیفہ عثمان نے انہیں بخششوں پر اکتفا نہ کیا بلکہ عمر بن خطاب نے اپنے زمانے میں جن لوگوں پر بالخصوص زیادہ سختی کی تھی، ان کے وظیفوں میں اضافہ کر دیا۔ ابن سعد کی روایت کے مطابق عثمان بن عفان نے زبیر ابن العوام کو چھ ہزار درہم، طلحہ کو دو ہزار درہم[3] اور مروان بن حکم کو چھ سو ہزار درہم دیے۔[4]

ابن سعد نے مزید لکھا ہے کہ جب زبیر کی موت واقع ہوئی تو اس

---

[1] طبری جلد ۶ صفحہ ۲۸۰۴ [2] انقلاب بزرگ صفحہ ۷۹

[3] ابن سعد جلد ۳ حصہ اول صفحہ ۵۷ [4] یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۱۴۳

نے اسکندریہ کوفہ اور بصرہ میں مکانات اور زمینیں چھوڑیں[1] اسی طرح زبیر کا ترکہ چار کروڑ اور طلحہ کا تین کروڑ تھا۔[2]

اب ذرا دوسرا پہلو بھی دیکھیں کہ امام علیؑ نے اپنے گورنروں کو جو خط لکھے اور جو خطبے دیے ان سے ظاہر ہے کہ عثمان کے بعد وہ کن مشکلات سے دوچار ہوتے۔ پھر یہ دیکھ کر رسول اکرمؐ کی سنت کو کس طرح تبدیل کیا گیا ہے، انہیں کتنا دکھ ہوا۔ وہ مسلمانوں کے درمیان مساوات قائم رکھنے کے بارے میں اتنے محتاط تھے کہ جب انہوں نے سنا کہ ان کا ایک گورنر اشراف میں سے کسی شخص کی دعوت میں شریک ہوا ہے تو اس پر اعتراض کیا اور فرمایا: تم ایسے دسترخوان پر کیوں بیٹھتے ہو جس پر صرف دولتمند لوگوں کو بلایا جاتا ہے اور حاجتمندوں کو اس سے محروم رکھا جاتا ہے۔

رسول اکرمؐ کے عہد میں اور ابوبکر و عمر کے زمانے میں صحابہ کی سیرت یہ تھی کہ جس چیز کی انہیں ضرورت ہوتی اس کے حصول کو کافی سمجھتے تھے اور دولت جمع کرنے کو اپنا معمول نہیں بناتے تھے لیکن خلیفہ عثمان کے دور میں یہ سیرت بدل گئی تھی۔ ان کے اور معاویہ کے زمانے میں صحابہ اور تابعین کی دولت کے انباروں سے بخوبی پتا چلتا ہے کہ مسلمان زہد اور تقویٰ کہ جو مسلمانی کی شرط ہے، اس سے کس قدر دور ہو گئے تھے۔ مسلمانوں کے مال کو دیدہ دلیری کے ساتھ ہڑپ کرنے کی یہ روش قریش اور اموی خاندان کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگوں میں بھی سرایت کر گئی تھی۔

---

[1] ابن سعد جلد ۳ حصہ اول صفحہ ۷۵

[2] ایضاً ـــــــ ۱۵۸

چنانچہ امام علیؑ کی خلافت میں چند گورنروں کو جونہی یہ معلوم ہوا کہ ان کے ساتھ خلیفہ کا سلوک عثمان جیسا نہیں ہوگا تو انہوں نے مسلمانوں کا وہ مال جو ان خائنوں کے اختیار میں تھا سمیٹا اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ جب ان میں سے ایک مصقلہ ابن ہبیرہ کو ابن عباس کے پاس لایا گیا تاکہ بیت المال کا جو اثاثہ اس کے ذمے تھا اس کی ادائیگی کرے تو اس نے کہا: اگر میں ابن عفان سے اس سے زیادہ مال بھی طلب کرتا تو وہ ہرگز دریغ نہ کرتے، بعد ازاں وہ بصرہ سے بھاگ کر معاویہ کے پاس چلا گیا۔[1]

یہ شخص جو بظاہر مسلمان تھا اور خود مسلمانوں کی سرزمین کے ایک حصے پر حکومت کرتا رہا تھا جب اس سے بازپرس کی گئی تو وہ اپنے کردار کو خدا کی کتاب اور سنت رسولؐ سے منطبق کرنے یا خلاف سنت کام کیا ہے تو توبہ کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ اس نے ہرگز یہ نہیں سوچا کہ یہ مال کسی ایک شخص کا نہیں بلکہ سب مسلمانوں کا ہے۔ اس نے جواب میں فقط یہ کہا کہ اگر میں پہلے خلیفہ سے اس سے بھی زیادہ مانگتا تو وہ دینے سے ہرگز دریغ نہ کرتے۔ یہ ہیں معنی سنت کے مرجانے اور بدعت کے زندہ ہونے کے! اس بے حکمی کی نوبت یہاں تک آپہنچی کہ امام علیؑ کے چچازاد بھائی نے بھی مسلمانوں کا مال ہتھیا لیا اور جب ابوالاسود دوئلی کی شکایت پر امام علیؑ نے اس سے بازپرس کی تو اس نے جواب میں لکھا: میں چاہتا ہوں کہ خدا سے ملاقات کروں تو مسلمانوں کا مال میرے ذمے ہو، تاکہ وہ تمام خون جو کسی نے امارت اور بادشاہی تک پہنچنے کے لیے بہائے ہیں، یہ بھی ان کے برابر میں محسوب کیا جائے۔[2]

---

[1] علی و فرزندانش صفحہ ۱۲۷ [2] عقدالفرید جلد ۵ صفحات ۹۸-۹۷
اس خط کا آخری حصہ طبری اور ابن اثیر میں نظر نہیں آتا۔

اس میں شک نہیں کہ ابن عباس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ امام علیؑ نے جو خون بہایا وہ انہوں نے اپنی ذاتی خواہشات کی تکمیل کے لیے نہیں بہایا۔ کیونکہ جمل، صفین اور نہروان کی جنگوں میں ان کا مقصد حکومت یا بادشاہی حاصل کرنا نہیں تھا بلکہ وہ مسلمانوں میں وحدتِ کلمہ اور اجرائے عدالت کے طالب تھے۔ وہ بخوبی جانتا تھا کہ بیت المال کے معاملے میں امام علیؑ اس پر جو سخت گیری کر رہے تھے وہ بھی کسی ذاتی منفعت کے لیے نہیں تھی بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ حاجتمندوں کے مال میں سے ایک دینار بھی ان کے یا ان کے عاملوں کے ہاتھوں تلف نہ ہونے پائے۔ وہ ان سب باتوں کو دوسروں سے بہتر جانتا تھا، کیونکہ وہ امام علیؑ کے ساتھ پلا بڑھا تھا اور ان کی سیرت سے بخوبی واقف تھا لیکن ایک اور حقیقت کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ ہجرت کے چالیسویں سال کا ابن عباس ہجرت کے دسویں سال کا ابن عباس نہیں تھا۔ اس مدت میں اس پر بھی اپنے ہم پلہ اور اپنے سے کمتر دسیوں اور سیکڑوں مسلمانوں کی طرح زمانے کا زنگ چڑھ گیا تھا۔ اگرچہ عمر ابن خطاب اپنے وقت میں ابن عباس کے علم وفضل کی بنا پر اسے رسول اکرمؐ کے دوسرے اصحاب پر فوقیت دیتے تھے لیکن انہوں نے کبھی کوئی ذمہ داری اس کے سپرد نہیں کی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں ڈرتا ہوں، کہیں وہ قرآن کی آیات کی تاویل کر کے مسلمانوں کے مال و دولت میں تصرف نہ کرنے لگے[1]

یہ تنہا ابن عباس ہی نہ تھا جس نے بیت المال میں تصرف کرنے

---

[1] عقد الفرید جلد ۵ صفحہ ۹۶

کے لیے ایسی تاویلوں سے کام لیا۔ کیونکہ ہم رسول اکرمؐ کے بہت سے اصحاب کو جانتے ہیں جنہوں نے اسلام کی جنگیں اپنی جانیں ہتھیلیوں پر رکھ کر لڑیں اور خدا کی رضا کے لیے دشمن کی جانب پیش قدمی کی۔ ہم ان میں سے کئی ایسوں کو بھی جانتے ہیں جو بیت المال کے مصرف میں احتیاط برتتے تھے۔ لیکن جونہی رسول اکرمؐ کا سایہ ان کے سر پر سے اٹھ گیا، چند سالوں میں ہی ان کے زمانے کی سادگی اور آزادی ختم ہو گئی۔ جبکہ ان اصحاب کو مفتوحہ ممالک سے کثیر دولت موصول ہونے لگی اور پھر وہ اپنی آسائش کو بے مزہ کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ چنانچہ بجائے اس کے کہ وہ قدم آگے بڑھا کر ہر پیدا ہونے والی بدعت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتے، وہ اپنے گھروں میں بیٹھ گئے اور انہوں نے اپنے اس طرز عمل کی توجیہہ کے لیے مختلف قسم کی دلیلوں سے کام لیا۔ حتیٰ کہ بدعت کا درخت خوب بڑا ہو گیا اور اس کی بہت سی شاخیں پھوٹ نکلیں۔ شاید وہ شروع میں یہ نہیں چاہتے تھے کہ نوبت یہاں تک پہنچے لیکن ان حالات کا یہ انجام ناگزیر تھا۔ کیونکہ اگر کسی معاشرے میں جزوی طور پہ ناانصافی پیدا ہو جائے اور اس کا فوری سدّباب نہ کیا جائے تو یکے بعد دیگرے کئی اور ناانصافیاں بھی جنم لیتی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ مختلف مقامات پر کئی سادہ دل انسان ایسے بھی ہیں جو ابھی تک بعض احادیث کے ظاہری معانی پہ قائم ہیں اور ان کے صحیح معانی دریافت کرنا نہیں چاہتے۔ وہ اس بات کو قبول نہیں کرنا چاہتے کہ رسول اکرمؐ نے جن اصحاب کے متعلق فرمایا ہو کہ: "وہ ستاروں کی مانند ہیں اور تم ان میں سے جس کسی کی اقتدا کرو گے سیدھا راستہ پا لو گے۔" وہ ــــ سبھی صحابہ ایسے نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد وہ ہیں جنہوں نے آنحضرتؐ کی

طرح زندگی گزاری یا ان کے بعد امتحان میں کامیاب رہے اور ان کی سنت کی حفاظت کرتے رہے۔ یعنی وہ سادہ لوگ اس بات کو تسلیم کرنا نہیں چاہتے کہ رسول اکرمؐ کے اصحاب میں ایسے اشخاص بھی تھے جو آزمائش میں پورے نہیں اترے۔ تاہم اکثر اوقات یہ ممکن ہوتا ہے کہ ایک مسلمان دین کی راہ میں اور اس کے نام کی بلندی کی خاطر بہت کوشش کرے لیکن بعد میں ایک ایسا وقت بھی آئے کہ جب اسے آزمائش سے گزرنا پڑے۔ یہی وہ وقت ہوتا ہے کہ اگر اس کا ایمان قوی نہ ہو تو نفسانی خواہشات اس پر غالب آجاتی ہیں۔ وہ اپنے طرزِ عمل کے لیے بہانے تلاش کرتا ہے اور جو ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے اسے اپنی مرضی کی تاویلیں کر کے نظر انداز کر دیتا ہے۔ پھر وہ اسی طرح آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک دن ایسا بھی آتا ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ اس کے اعمال اور دین کے احکام میں بڑا طویل فاصلہ پڑ گیا ہے۔ اسی بنا پر رسول اکرمؐ نے مسلمانوں کو قرآن مجید کی زبان میں اس آزمائش سے خبردار کیا تھا، جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

"اَحَسِبَ النَّاسُ .... وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ"

کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ فقط اتنا کہہ دینے سے چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لے آئے ہیں، جبکہ ابھی انکا امتحان نہیں لیا گیا ہو گا۔ (عنکبوت۔ آیت ۲)

ایسی آزمائش بہت سے مسلمانوں کو پیش آئی، ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنہیں رسول اکرمؐ کی صحبت میسر رہی اور جنہوں نے اسلام کی راہ میں بڑی سخت تکلیفیں اٹھائی تھیں لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ امام وقت رسول اکرمؐ کی سنت کو زندہ کرنے کی خاطر اس بات پر راضی نہیں

ہیں کہ وہ انہیں مسلمانوں کا مال بے حساب بخش دیں تو وہ ان (امام وقت) سے کنارہ کش ہو گئے۔ پھر وہ ان کے مقابلے پر کھڑے ہو گئے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اس گناہ کو انہوں نے دین کا رنگ دے دیا اور کچھ سادہ لوح اور موقع پرست لوگ بھی ان کے گرد جمع ہو گئے۔ ہم نے تاریخ میں بارہا پڑھا ہے اور اکثر خود بھی دیکھا ہے کہ کوئی ایک شخص یا کئی اشخاص اقتدار یا مال حاصل کرنے کے لیے کوئی بدعت گھڑ لیتے ہیں اور اس پر لوگوں کو فریفتہ کر لیتے ہیں۔ اگرچہ شروع میں ان کو خوب معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ چاہتے ہیں وہ دین نہیں بلکہ دنیا ہے لیکن آہستہ آہستہ مغالطے میں پڑ جاتے ہیں اور کچھ مدت گزرنے کے بعد یہ باور کرنے لگتے ہیں کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں یا کہہ رہے ہیں وہ خدائے تعالیٰ کی خوشنودی اور لوگوں کی بھلائی کی خاطر ہے۔

چنانچہ جس دن طلحہ اور زبیر مسلمانوں کے گروہ سے جدا ہوئے اور رسول اکرمؐ کی ایک زوجہ کو ساتھ لے کر بصرہ کو چل پڑے تھے۔ اس پہلی علیحدگی کے نتیجے میں اسلامی معاشرے میں برادرکشی کا آغاز ہو گیا تھا۔ شاید وہ اپنے خیال کے مطابق دین کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ایک سنت کے احیاء کو اپنے عمل کا بہانہ بنایا اور کہنے لگے کہ ہم اس بات کی اجازت نہیں دے سکتے کہ ایک مظلوم خلیفہ کا خون پامال ہو۔ نہ جانے وہ یہ باتیں اپنے بے چین ضمیر کو مطمئن کرنے یا لوگوں کو فریب دینے کے لیے کرتے رہے لیکن شاید وہ اس دن بھی یقین رکھتے تھے کہ وہ دین کی راہ پر چل رہے ہیں۔ مگر کیا یہ وہی دین تھا جو قرآن مجید میں آیا اور رسول اکرمؐ نے پہنچایا تھا یا اس دین کی تاویل تھی جو وہ کر رہے تھے؟ حقیقت یہ ہے

جو فرمانبردار ہوں ان کے ساتھ اچھا سلوک کروں اور ان پہ سختی نہ کروں۔ میری تلوار اور میرا تازیانہ اس شخص کے سر پہ ہیں جو میرا حکم بجا نہ لائے بہتر ہوگا کہ تم میں سے ہر ایک اپنی فکر کرے"۔ [1]

آپ اس کتاب کے متعدد ابواب میں دیکھیں گے کہ اس نصف صدی میں کئی ایک عوامل اسلامی معاشرے کے سقوط کا موجب بنے لیکن ان میں سے کوئی عامل بھی "دولت جمع کرنے کی رغبت" کے برابر مؤثر ثابت نہیں ہوا۔ امام حسینؑ نے ہر دوسرے شخص سے بہتر طور پر اس حقیقت پر سے پردہ اٹھایا ہے۔ آپ فرماتے ہیں: "لوگ دنیا کے بندے ہیں، دین کو اسی حد تک چاہتے ہیں جس حد تک وہ ان کی دنیاوی زندگی کو سنوارے۔ پھر جب آزمائش کا وقت آتا ہے تو حقیقی دیندار بہت تھوڑے رہ جاتے ہیں"۔ میں جانتا ہوں کہ ان باتوں میں سے کسی ایک کو دہرانا آجکل کے کئی مسلمانوں کے لیے رنج کا باعث ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ ان لوگوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچاؤں جو یہ کوشش کرتے ہیں کہ ان مسائل سے قطع نظر کریں اور انہیں بھول جائیں لیکن اگر میں ان سوالات کا صحیح جواب دریافت کرنا چاہتا ہوں تو ان مطالب کو لکھنا ہی پڑے گا۔ جن لوگوں سے رسول اکرمؐ سے نصف صدی بعد کا معاشرہ تشکیل پاتا تھا' ان کے لیے دین اسلام کے احکام سے دور جا پڑنا اور عہد جاہلیت کی رسوم کی طرف مائل ہونا ایک فطری چیز تھی کیونکہ جس معاشرے پر دین اور تقویٰ کا رنگ غالب نہ ہو اس میں ہر ناجائز فعل کی پیدائش اور اشاعت چنداں غیر معمولی معلوم نہیں ہوتی۔

---

[1] طبری جلد ۷ صفحہ ۲۴۲

مسلمانوں میں مناظرہ کا رواج

فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِھِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَہَ مِنْہُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَۃِ۔

پس وہ لوگ جن کے دل حق سے باطل کی طرف مائل ہیں فساد برپا کرنے کے لیے متشابہ آیتوں کی پیروی کرتے ہیں۔

(آل عمران۔ آیت ۷)

قرآن مجید میں ہر دوسری الہامی کتاب کے مقابلے میں علم اور تدبر کی جانب زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ ہم اس میں بہت سی آیات دیکھتے ہیں جن میں لوگوں کو اندھا دھند اطاعت سے منع کیا گیا ہے اور تقلیدی دین کی برائی ظاہر کی گئی ہے۔ تاہم اس بات کا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ رسول اکرمؐ نے اپنے دین کی تبلیغ کے لیے وہ روش اختیار فرمائی ہو، جسے بعد میں مسلمانوں کے علمی مراکز میں استدلال منطقی (برہان) کا نام دیا گیا۔ قرآن مجید جب

لوگوں کو خدا سے متعارف کرانا چاہتا ہے تو انہیں فطرت محسوس کی جانب متوجہ کرتا ہے اور فرماتا ہے:

"یہ لوگ آسمانوں اور بادلوں کو کیوں نہیں دیکھتے کہ وہ کیسے پیدا کیے گئے ہیں۔ کیا وہ یہ نہیں جانتے کہ یہ پہاڑ، سمندر، چاند اور ستارے بیکار پیدا نہیں کیے گئے۔ خدا کے علاوہ آسمانوں اور زمین پر کسی کا حکم نہیں چلتا۔ کیا وہ یہ نہیں دیکھتے کہ جو کچھ اس دنیا میں ہے نابود ہو جاتا ہے اور خدا کے علاوہ کوئی چیز باقی نہیں رہتی؟"

جب وہ خدا کا وجود قطعی دلیل سے ثابت کرنا چاہتا ہے تو کہتا ہے:

"خدا تمہاری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے"۔

وہ خدا کے وجود کو زیادہ قابل فہم بنانے کے لیے کہتا ہے:

"کیا آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے خدا کے وجود کے بارے میں کوئی شک ہے؟ اگر خدا نہ ہو تو اس دنیا کا نظام درہم برہم ہو جائے"۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جب رسول اکرمؐ نے لوگوں کو قرآن کی آیات پڑھ کر سنائیں اور انہیں خدا کی صفات (مثلاً عالم، خالق، قادر، سمیع اور بصیر) بتائیں تو ان کے اصحاب نے ایک طرح سے ان کے معنی ضرور سمجھ لیے لیکن یہ امر مسلم ہے کہ وہ کسی طور بھی اس فکر میں نہیں تھے کہ ان صفات کے خدا سے تعلق کی نوعیت کیا ہے، یعنی کیا خدا کی صفات اس کی عین ذات ہیں یا اس کی ذات کے علاوہ ہیں؟

اسی طرح ان کو یہ فکر بھی لاحق نہیں ہوتی تھی کہ جزئیات

کے بارے میں خدا کے علم کی کیا نوعیت ہے؟ جزئیات میں جو تبدیلیاں ہم دیکھتے ہیں کیا ان کے ساتھ ساتھ خدا کا علم بھی تبدیل ہوتا ہے یا نہیں؟ کیا خدا کا علم چیزوں کی حقیقت کی شکل اختیار کرنے کا موجب ہے؟ یعنی اگر وہ کسی چیز کا علم رکھتا ہے تو وہ چیز اسی شکل میں وجود پذیر ہو جس میں وہ خدا کے علم میں ہے، تاکہ خدا کا علم جہل نہ بن جائے یا خدا کا علم چیزوں کے وجود کی علت نہیں ہے؟ کیا انسان اپنے افعال میں مختار ہے یا مجبور؟ ان لوگوں کے سادہ ذہنوں میں جنہیں اس قسم کی بحثوں کی تعلیم نہیں دی گئی تھی، ایسے سوالات نہیں اٹھتے تھے۔ مختصراً یہ کہ وہ پہلے لوگ اسلام کی جانب ان دو عوامل کی بنا پر راغب ہوتے تھے:

۱۔ رسول اکرمؐ کا اپنے پیغمبر ہونے اور اپنی دعوت کے حق ہونے پر راسخ ایمان اور آنحضرتؐ کا لوگوں کی سادہ اور طبعی عقل کو بیدار کر کے ایمان ان کے اندر داخل کرنا۔ یہ وہی انسانی قوت ہے جسے بعد میں اسلامی علمِ اخلاق میں 'ملکۂ اعتدال تمیز' کا نام دیا گیا اور علمائے اخلاق نے کوشش کی کہ مسلمانوں کو فکر و نظر میں افراط اور تفریط سے روکیں تاکہ ان کے نفس میں 'اعتدال تمیز' کا ملکہ پیدا ہو۔ انہوں نے ان دونوں طرفوں کو جربزہ اور بلاہت کے نام دیے۔

۲۔ لوگوں کا اس بات پر ایمان اور اعتقاد کہ رسول اکرمؐ جو فرماتے ہیں سچ فرماتے ہیں اور وہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔

اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ جن بحثوں اور مناظروں کا رواج پہلی صدی ہجری کے دوسرے حصے میں ہوا، وہ رسول اکرمؐ کے دور میں بھی وقوع پذیر ہوئے، اس کی بجائے مسلمانوں کا اپنے پیغمبرؐ پر اعتقاد

اس درجے پر تھا کہ آنحضرتؐ جو کچھ فرماتے وہ اسے قبول کر لیتے تھے۔ جب لوگوں نے ابو بکر بن قحافہ سے کہا: کیا تمہیں علم ہے کہ تمہارے رفیق (محمدؐ) نے کیا نیا دعویٰ کیا ہے؟ انہوں نے پوچھا: "وہ کیا دعویٰ کرتے ہیں؟" لوگوں نے کہا: ان کا کہنا ہے کہ گزشتہ رات انہیں آسمانوں پر لے جایا گیا۔ ابو بکر نے کہا: اگر انہوں نے یہ بات فرمائی ہے تو یہ ضرور درست ہے۔"[1]

اصولاً جزیرہ نمائے عرب کے صحرانشینوں حتیٰ کہ شہروں میں رہنے والوں کی سادہ اور صاف فطرت ان کو بھی ان بحثوں میں پڑنے سے روکتی تھی۔ رسول اکرمؐ پر ان کے ایمان کا یہ عالم تھا کہ شبہات کو منطق اور جدل کے ذریعے دور کرنا تو کجا وہ مابعد الطبیعیت کے مسائل کے بارے میں سوچنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے تھے بلکہ بعض اوقات کوئی شخص رسول اکرمؐ کی زبان سے بسم اللہ کی تلاوت سن کر مسلمان ہو جاتا تھا[2] جیسا کہ عتبہ اور شیبہ کے غلام عداس کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ نیز بعض اوقات قرآن مجید کی چند آیات سن کر ہی آنحضرتؐ کے سخت ترین دشمنوں کے دل نرم پڑ جاتے تھے اور وہ اسلام قبول کر لیتے تھے۔

چنانچہ عمر بن خطاب کے اسلام لانے کے بارے میں کہا گیا ہے: جب انہوں نے سنا کہ ان کی بہن اور بہنوئی نے نیا دین قبول کر لیا ہے تو وہ ان کے گھر گئے۔ اس وقت خباب بن ارت بھی ان دونوں کے پاس تھے جو انہیں قرآن مجید پڑھا رہے تھے۔ جب خباب نے عمر بن خطاب کو دیکھا تو وہ چپ ہو گئے۔ ان کی بہن نے قرآن مجید کے اوراق بھی اپنے

---

[1] ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۵ [2] ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۳

دامن میں چھپا لیے تاکہ عمر انہیں دیکھ کر پھاڑ نہ دیں۔ تب بہن اور بھائی کے درمیان کچھ لے دے ہوتی رہی۔ پھر جب عمر نے اپنے آپ کو پاکیزہ کر لیا اور اس بات کا اطمینان دلایا کہ وہ قرآن کے اوراق کو نہیں پھاڑیں گے، اس نے اوراق اس کے ہاتھ میں دیدیے۔ انہوں نے لکھے ہوئے الفاظ پہ غور کیا اور کہا: "کتنی عظیم اور اچھی باتیں ہیں"۔ کہا جاتا ہے کہ جو صفحہ عمر بن خطاب نے پڑھا، اس پر سورۂ مریم کی چند آیات لکھی تھیں، وہی چند آیتیں پڑھ کر عمر بت پرستی چھوڑ کر مسلمانوں میں آملے۔[1]

تاہم فقط عمر بن خطاب اور عداس ہی وہ اشخاص نہ تھے جو خدا کا نام سن کر یا قرآن کی آیات کو پڑھ کر مسلمان ہو گئے۔ بلکہ ہم ایسے اور بھی دسیوں لوگوں کے بارے میں جانتے ہیں جو رسول اکرمؐ کے پاس بحث مباحثے یا انکار و اعتراض کے مقصد سے آتے لیکن جب آپ نے ان سے باتیں کیں اور ان کو قرآن مجید کی آیات پڑھ کر سنائی گئیں تو وہ مسلمان ہو کر اٹھے لیکن اس کے چند سال بعد جب امام علیؑ نے اپنے چچا زاد بھائی عبداللہ ابن عباس کو خوارج کے ساتھ گفتگو کرنے بھیجا تو انہیں ہدایت کی کہ ان لوگوں کے ساتھ قرآن کے حوالے سے گفتگو نہ کرنا، کیونکہ آیات کے گوناگوں معنی نکل سکتے ہیں۔ لہٰذا تم ایک بات کہو گے تو تمہارا مخالف ان آیات کی تفسیر کرتے ہوئے ان کے دوسرے ہی معنی نکالے گا اور تم بے بس ہو کر رہ جاؤ گے۔ جنگ نہروان کے حالات میں ہم دیکھتے ہیں کہ امام علیؑ کے بعض مخالفین جب میدان میں آتے تو قرآنی آیات کی تلاوت کرتے تھے۔

---

[1] ابن ہشام جلد ۱ صفحات ۳۶۴ - ۳۷۰

تاکہ امام علیؑ کو اشارۃً بتادیں کہ چونکہ (نعوذ باللہ) تم کافر ہوگئے ہو اس لیے تمہارے سابقہ اعمال بھی برباد ہوگئے ہیں۔ پس جب اس پہلی صدی کے ربع اول میں ہمیں ایسی تاویلوں کا کوئی ایک نمونہ بھی نظر نہیں آتا تو پھر کیا وجہ ہوئی کہ اس کے بعد قرآن مجید کو سمجھنے کے معاملے میں اسلامی معاشرے کی حالت اس قدر متغیر ہوگئی؟ کیا آپ کو اس کے علاوہ اس کی کوئی اور وجہ دکھائی دیتی ہے کہ مسلمان کلامی بحثوں میں الجھ گئے۔ ان کی روح ایمان متزلزل ہوگئی اور ان کے مزاج میں استقامت نہ رہی تھی۔ جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے کہ رسول اکرمؐ کے زمانے میں ان کے ارشادات پر لوگوں کا اس حد تک ایمان تھا کہ وہ اپنے آپ کو مابعد الطبیعت کے مسائل میں نہیں الجھاتے تھے۔ بلکہ رسول اکرمؐ کی راستگوئی پر اعتقاد اور ان کے شیوۂ تسلیم و رضا نے ان کے دل میں ایک ایسی قطعی یکسوئی پیدا کر دی تھی جو اس میں شک و شبہ کو ہرگز راہ نہیں دیتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اپنے اعتقاد کے بارے میں مزید کچھ سوچتے ہوئے بھی ڈرتے تھے۔ جیسا کہ ایک شخص رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: "اے خدا کے رسولؐ! مجھے بچائیے کہ میں تباہ ہوگیا ہوں"۔

آنحضرتؐ نے فرمایا: ہمیں پتا ہے کہ شیطان تمہارے پاس آیا اور اس نے تم سے پوچھا: تمہیں کس نے پیدا کیا؟ تم نے جواب دیا: خدائے تعالیٰ نے۔ اس نے پوچھا: خدا کو کس نے پیدا کیا ہے؟ اس کا تم کوئی جواب نہ دے سکے۔ کیا ایسا ہی نہیں ہوا؟ اس شخص نے کہا: جی ہاں! مجھے اس خدا کی قسم ہے جس نے آپ کو نبوت سے سرفراز کیا، واقعاً ایسا ہی ہوا ہے۔ [1]

---

[1] اصول کافی جلد ۲ صفحہ ۴۲۵۔

اس سوال و جواب سے پتا چلتا ہے کہ رسول اکرم ؐ جو کچھ فرماتے مسلمان اسے قبول کر لیتے تھے اور اگر کبھی توہم سے دوچار ہوتے تو اپنے آپ ہی کو موردِ الزام سمجھتے تھے لیکن ابھی اس زمانے کے بعد چوتھائی صدی بھی نہیں گزری تھی کہ ایک شخص نے امام علیؑ سے پوچھا: کیا ہمارا شام جانا خدائے تعالیٰ کی قضا و قدر کے مطابق تھا؟ آپ نے جواب دیا: "ہاں!" اس پر وہ شخص کہنے لگا: پھر اس صورت میں تو میرے جہاد کا کوئی ثواب نہیں، کیونکہ مقدر یوں ہی تھا۔ تب امام علیؑ نے جواب میں فرمایا: یوں معلوم ہوتا ہے کہ تم نے قضا کو لازم اور قدر کو حتمی سمجھ لیا ہے۔ اگر ایسا ہو تو ثواب اور سزا باطل اور وعدے وعید بے اثر ہو جائیں گے۔ [1]

قضا و قدر اور جبر و اختیار کے بارے میں بحث ایک ایسا موضوع ہے جو نو مسلم قوموں کے علم کلام سے اسلامی عقیدے کا رابطہ قائم ہونے کے بعد پہلی مرتبہ کوفہ میں ظاہر ہوئی۔ یہ وہ تحفہ تھا جو جزیرہ نما کے مشرق اور شمال مشرق میں رہنے والے نئے مسلمان اس سرزمین کے سادہ طبیعت باشندوں کے لیے لائے۔ اب خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کے بعد کتنی صدیوں تک اور کس حد تک اسلامی مراکز نے ان بحثوں میں اپنا وقت، قوت اور جانیں ضائع کیں لیکن ایک نکتہ مسلم ہے اور وہ یہ کہ ان بحثوں کا ان تعلیمی مراکز میں ورود فطری تھا اور یہ ایک ایسا امر تھا جس سے اجتناب ممکن نہ تھا۔ اسی وقت سے ہر فرقے اور پیشوا یا ہر قسم کے علمی اور سیاسی نقطہ نگاہ کے طرفداروں نے کوشش کی کہ وہ اپنے نظریے کو صحیح ثابت کرنے کے لیے قرآن کے ظاہری معنی کا سہارا لیں۔ پھر تاویل قرآن میں افراط کی

[1] نہج البلاغہ صفحہ ۹۹

نوبت یہاں تک آپہنچی کہ رسول اکرمؐ کے فرزندوں کا قاتل بھی اپنے گھناؤنے کردار کی توجیہہ کے لیے قرآن مجید کی آیت کا حوالہ دیتا تھا اور امام حسینؑ کے قتل کو خدا کی تقدیر اور ان کے اپنے کردار کا نتیجہ گردانتا تھا۔[1]

اگر وہ اعتقاد اور وہ خالص ایمان جس کا پہلی چوتھائی صدی میں مسلمانوں کے معاشرے پر راج تھا، وہ اسی طرح برقرار رہتا —— اور یہ امر مسلم ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہ تھا —— تو کربلا کا تو کیا سوال ہے، شاید جمل، صفین اور نہروان کی جنگوں یا کم از کم نہروان کی جنگ کے لیے بالخصوص کوئی گنجائش باقی نہ رہتی اور عام اعتقاد کی حرمت کو اتنے زخم نہ کھانے پڑتے کیونکہ ہر حادثے کے ظہور کے بعد ایک اور حادثہ وقوع پذیر ہوتا ہے اور ہر تاویل ایک دوسری تاویل کو جنم دیتی ہے۔ نیز کسی صریح حکم سے فرار کے نتیجے میں ایک اور فرار کی راہ کھلتی ہے۔ یہاں تک کہ جو ہونا چاہیے تھا اور جو کچھ ہوا، اس میں بڑا فرق پڑ جاتا ہے۔

---

[1] جب اسیران اہلبیتؑ کو یزید کے محل میں لایا گیا تو اس نے امام علیؑ ابن الحسینؑ کو مخاطب کر کے کہا: تمہارے باپ نے رشتہ داری کی رعایت نہ کی، میرے حق کو نظرانداز کر دیا اور حکومت کی خاطر میرے ساتھ جنگ کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر خدا نے اس کے ساتھ وہ کیا جو تم نے دیکھا۔ امام علیؑ ابن الحسینؑ نے اس کے جواب میں یہ آیت پڑھی: ما اصاب من مصیبۃ فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتاب من قبل ان نبرأھا۔ یزید نے اپنے بیٹے خالد سے کہا: انہیں جواب دو۔ خالد کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کہے۔ یزید نے لقمہ دیا کہ کہو وما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم ویعفوا عن کثیر۔ (طبری جلد ۷ صفحہ ۳۷۷)

مسلمانوں میں قبائلی تعصب کا نفوذ

اِذْ جَعَلَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ قُلُوْبِہِمُ الْحَمِیَّۃَ حَمِیَّۃَ الْجَاھِلِیَّۃِ

جب کافروں نے جاہلیت کی حمیت کو اپنے دلوں میں جگہ دی۔

(فتح - آیت ۲۶)

جیسا کہ گزشتہ ابواب میں کہا گیا ہے جزیرہ نمائے عرب کے کچھ لوگ اس کے جنوب میں آباد اور قابل کاشت علاقوں میں زندگی بسر کرتے تھے اور کچھ حجاز کے ان شہروں میں رہتے تھے جن کو تجارتی اہمیت حاصل تھی۔ یہ دونوں گروہ جہاں طرزِ زندگی اور ماحول کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف تھے وہاں نسل کے لحاظ سے بھی دو حصوں میں تقسیم ہوتے تھے یعنی جنوب کے باشندے قحطانی یا یمانی اور مغرب اور شمال مغرب کے رہنے والے عدنانی کہلاتے تھے۔ ان دونوں نسلوں کے یہ نام ہر ایک کے مورثِ اعلیٰ کے نام پر رکھے گئے تھے۔

مزید برآں ان دونوں گروہوں کے لوگ مختلف قبیلوں، شاخوں اور خاندانوں میں بٹے ہوئے تھے۔ قحطانیوں کی سرزمین کے محل وقوع کی بنا پر ان کا تمدن عدنانیوں کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ ظہور اسلام کے وقت اہم ترین قحطانی قبیلے یہ تھے:

سبا، حمیر، کہلان، ازد، مازن، غسان، اوس، خزرج، خزاعہ، بجیلہ، ختعم، ہمدان، طی، لخم، کندہ، قضاعہ اور کلب۔

اسی طرح عدنانی یا حجاز کے عرب بھی بہت سے عرب قبیلوں اور خاندانوں میں بٹے ہوئے تھے جن میں سب سے زیادہ اہم معدی تھے۔ معدیوں سے بھی کئی ایک شاخیں پھوٹتی تھیں، جن میں ایادی اور نزاری شامل تھے۔ ربیعہ اور مضر کے قبیلے نزاریوں ہی کی شاخیں تھیں اور ربیعہ کے لوگ عراق میں سکونت پذیر تھے۔ نیز اسد، جدیلہ، تغلب، بکر وغیرہ کے قبیلوں کا تعلق بھی اسی خاندان سے ہے۔ مضری حجاز میں تھے۔ بعد میں مضر کے بیٹے قیس کی نسبت سے مضریوں کو قیسی کہا جانے لگا۔ قریش کا نسب الیاس بن مضر بن نزار تک جاتا ہے لیکن اپنے انتہائی انتشار اور بدنظمی کے باوجود بھی ان قبیلوں نے ظہور اسلام سے کئی صدیاں پیشتر سے اپنے شجرہ ہائے نسب حفظ کر رکھے تھے۔ ایک چھوٹا خاندان بڑے سے اور بڑا ایک اور بڑے خانوادے سے مل جاتا تھا۔ اگر کسی قبیلے کا کسی دوسرے قبیلے سے جھگڑا ہو جاتا تو رشتہ دار اپنی قربت کے لحاظ سے ایک دوسرے کی مدد کو پہنچتے تھے۔

چنانچہ مثل مشہور ہے کہ میں اور میرا بھائی اپنے چچازاد بھائی کے مقابلے پر کھڑے ہو جاتے ہیں، جبکہ غیروں کے مقابلے پر میں اور میرا چچازاد مل کر ڈٹ جاتے ہیں۔ گویا نسبتی حمایتیوں کے آملنے سے جھگڑے کا دائرہ وسیع تر

ہو جاتا تھا اور پھر قحطانی اور عدنانی ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑے ہو جاتے تھے۔ مثلاً جب کبھی امویوں اور ہاشمیوں کے درمیان جھگڑا ہوتا تو خزاعہ یا ہمدان کوئی وجہ نہیں دیکھتے تھے کہ اپنے آپ کو اس جھگڑے میں ملوث کریں، بجز اس کے کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک ان سے مدد مانگے لیکن اگر قریش اور اوس یا خزرج کے درمیان جھگڑا ہو جاتا تو قدرتی طور پر خزاعہ ـــــ اوس کا اور ربیعہ ـــــ قریش کا ساتھ دیتے تھے لیکن ظہور اسلام کے ساتھ رسول اکرمؐ کے وعظ و نصیحت اور مسلمانوں کے درمیان بھائی چارہ قائم کرنے کے نتیجے میں خاندانی تعصبات وقتی طور پر بھلا دیے گئے۔ مگر ان کا مکمل طور پر قلع قمع نہ ہوا۔ کیونکہ رسول اکرمؐ اور ان کے پاک دل ساتھیوں کی زندگی اتنی طویل نہ ہوئی کہ وہ تمام قبیلوں کی عادات اور اخلاق کو بدل دیں اور انہیں احکام اسلام کے مطابق تربیت دیں۔

جن لوگوں نے حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرتؐ کا آخری خطبہ سنا، جس میں آپ نے فرمایا: دور جاہلیت میں جو خون بھی بہایا گیا، میں اسے اپنے پاؤں تلے روندتا ہوں۔ حاضرین نے یہ قول سنا اور شاید اسے قبول بھی کر لیا لیکن یہ معلوم نہیں کہ جو لوگ اس وقت موجود نہیں تھے اور جنہوں نے یہ بات نہیں سنی، انہوں نے پیغام رسانی پر مامور لوگوں کے کہنے پر کس قدر توجہ دی۔ جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے جو اس دن تک پیدا ہی نہیں ہوئے تھے، ان کا معاملہ اور بھی مختلف ہے۔ بہرحال بہت سے باایمان مسلمانوں کے مر جانے یا مارے جانے کے باعث عام لوگوں میں آہستہ آہستہ اتحاد و یگانگت کی روح کمزور ہو گئی لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، ایک طرف نسلی تعصبات کے خلاف عمر بن خطاب کی سخت گیری اور دوسری طرف

مسلمانوں کی بیرونی جنگوں میں مصروفیت نے انہیں اس بات کا موقع ہی نہ دیا کہ وہ اپنے ماضی کے بارے میں سوچیں یا زمانۂ جاہلیت کے امتیازات کو دوبارہ زندہ کرنے کا فیصلہ کریں۔ تاہم خلیفہ عمر مضریوں اور یمانیوں کے درمیان طاقت کا توازن برقرار رکھنے کے بارے میں احتیاط کرتے تھے۔ اگر وہ کسی شہر کا ایک حاکم کسی مضری کو مقرر کرتے تو ساتھ ہی یہ کوشش کرتے کہ دوسرا عہدیدار کسی یمانی کو مقرر کریں۔

بعد میں خلافت عثمان ابن عفان کو ملی اور انہوں نے عمر بن خطاب سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ان مقرر کیے ہوئے عاملوں کو ان کے عہدوں سے الگ نہیں کریں گے لیکن ابھی اس وعدے کو ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ انہوں نے پہلے عاملوں کو معزول کر کے ان کی جگہ نئے عامل مقرر کرنے شروع کر دیے۔ چنانچہ انہوں نے سعد بن ابی وقاص کو حکومت کوفہ سے ہٹا دیا اور ان کی جگہ اپنے رشتہ دار ولید بن عقبۂ ابن ابی معیط کو مقرر کیا جس نے رسول اکرمؐ کے بارے میں جھوٹی باتیں کہی تھیں اور جس کے بارے میں آیت نباء نازل ہوئی تھی۔ جب کوفہ کے لوگ ولید کی بداعمالیوں سے تنگ آ گئے تو اسے ہٹا کر بنی امیہ کے فرد "سعید ابن عاص" کو مقرر کر دیا۔ اسی طرح سعد ابن عبداللہ ابن ابی سرح کہ جس نے رسول اکرمؐ پر بہتان باندھا اور کافر ہو گیا تھا۔ وہ فتح مکہ کے بعد ڈر کے مارے دوبارہ اپنے آپ کو مسلمان کہنے لگا تھا، خلیفہ عثمان نے اس کو مصر کی حکومت دے دی۔

اس نے ابوموسیٰ اشعری کو جو یمانیوں میں سے تھا اور خلیفہ عمر نے اسے بصرہ کا حاکم مقرر کیا تھا چند سال اس عہدے پر برقرار رکھا لیکن پھر

قریش اور بالخصوص خلیفہ کے اموی رشتہ داروں کو خیال آیا کہ تین بڑے صوبوں کی باگ ڈور تو قریش کے ہاتھ میں ہے۔ یعنی کوفہ ــــــ ولید کے پاس، شام ــــــ معاویہ کے پاس اور مصر عمرو بن عاص کے پاس ہے۔ گویا ان صوبوں کے حاکم مضری ہیں اور فقط بصرہ کا حاکم ایک یمانی (ابو موسیٰ) ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک مضری شخص جس کا تعلق بنی ضبہ سے تھا وہ عثمان بن عفان کے پاس آیا اور کہنے لگا: کیا تمہارے پاس کوئی ایسا لڑکا نہیں ہے کہ جسے بڑا گردانتے ہوئے بصرہ کی حکومت اسے دے دو؟ آخر یہ بوڑھا (ابو موسیٰ) کب تک بصرہ میں رہے گا؟[1] اس پر خلیفہ عثمان نے اسے بھی معزول کر دیا۔

اس تفصیل میں جو اس وقت کی مروجہ پالیسی کے مطابق معلوم ہوتی ہے، ان شرائط کا کوئی ذکر نہیں ہے جو اسلام میں مسلمانوں کے امیر کے لیے لازم قرار دی گئی ہیں۔ یعنی وہاں بحث اس مسئلے پر نہیں ہے کہ آیا کسی شہر کا حاکم لوگوں سے عادلانہ سلوک کرتا ہے یا نہیں؟ یہ سوال بھی نہیں آیا کہ وہ قرآنی حدود جاری کرتا ہے یا انہیں معطل کر دیتا ہے؟ بلکہ زیرِ غور مسئلہ یہ ہے کہ بصرہ ــــــ جہاں مضری زیادہ ہیں، وہاں کا حاکم ایک یمانی کیوں ہو؟ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ آگ جو راکھ کے نیچے دبی ہوئی تھی، ایک چوتھائی صدی کے بعد وہ از سرِ نو سُلگ اٹھی اور رفتہ رفتہ اس نے تمام اسلامی شہروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ کس طرح سنت مٹ گئی اور بدعت زندہ ہو گئی۔ یہاں میں ایک داستان بیان کرنا چاہتا ہوں،

---

[1] انقلاب بزرگ صفحہ ۱۲۱

جس کے بارے میں بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ یہ پہلی بے قاعدگی تھی جو مسلمانوں میں ظاہر ہوئی۔

کہا جاتا ہے کہ کوفہ کا حاکم سعید ابن عاص ایک رات مختلف قبیلوں کے سرداروں کے ساتھ ایک محفل میں شریک تھا اور وہاں طلحہ کی سخاوت کے متعلق باتیں ہونے لگیں۔ سعید نے کہا کہ جس شخص کے پاس اتنی اراضی ہو وہ بخشش کر سکتا ہے۔ اگر میرے پاس اتنی اراضی ہوتی تو میں تمہیں اس سے زیادہ دیتا۔ ہوتے ہوتے بات لمبی ہو گئی۔ حتیٰ کہ سعید نے کہا: "سواد (سرزمین عراق) قریش کا باغ ہے" اشتر نخعی کہ جو یمانی تھا اس نے کہا: "یہ سرزمین جسے ہم نے اپنی تلواروں سے حاصل کیا ہے' قریش کا باغ کیسے ہو سکتی ہے؟" تب سعید کے مقرر کردہ کوتوال عبدالرحمٰن اسدی نے کہا: "تم امیر کے سامنے یہ بات کہہ رہے ہو؟" یہ سن کر اشتر نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا تو وہ اس پر ٹوٹ پڑے اور اسے اتنا زدوکوب کیا کہ وہ بیہوش ہو گیا۔ [1]

اس دن سے یمانیوں اور مضریوں کے درمیان ایک دوسرے کے بارے میں خوف پیدا ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بجز چند یمانیوں کے جنہیں معاویہ نے مال دے کر ساتھ ملا لیا' سب یمانی امام علیؑ کے حامی بن گئے اور مضری معاویہ کے حمایتی بن گئے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ مضریوں اور یمانیوں کے درمیان یہ دھڑے بندی اور محاذ آرائی سالہا سال بلکہ کئی صدیوں تک ایک اور شکل میں جاری رہی لیکن اس کا نام بدل گیا اور انہیں مضری اور یمانی کی بجائے قیسی اور یمانی کہا جانے لگا۔ قیسیوں کا تعلق بنی عدنان سے اور یمانیوں

---

[1] ابن اثیر جلد ۳ صفحہ ۱۳۸-۱۳۹

کا بنی قحطان سے تھا۔ انہی دو گروہوں کی کشمکش کے نتیجے میں مروان اور ابن زبیر کے زمانے میں جنگ مرج الرہط وقوع پذیر ہوئی اور ان کے اختلافات اموی اور عباسی حکومت کے پورے دور میں شام، عراق، مصر، فارس، خراسان، افریقہ اور اندلس تک بڑھتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ عباسی دور میں ترکوں کی تشکیل میں ایک اور عنصر ظاہر ہوا تو یہ کشمکش کمزور پڑ گئی اور بالآخر ختم ہو گئی۔ اگر ہم یہاں ایک ایسی حکایت بیان کریں جس سے ان دو گروہوں کی کشمکش اور ایک دوسرے پر برتری جتانے کی نشاندہی ہوتی ہے تو بے محل نہ ہو گا۔ اگرچہ اس کا تعلق اس زمانے سے کئی سال بعد سے ہے، جس کا ہم اس وقت تجزیہ کر رہے ہیں۔

زیاد ابن عبید حارثی کہتا ہے:

"مروان ابن محمد کی خلافت میں کچھ لوگوں کے ہمراہ میں اسے ملنے گیا۔ وہاں ہمیں مروان کے کوتوال ابن ہبیرہ کے پاس لے جایا گیا۔ اس نے ایک ایک مہمان کا استقبال کیا اور ان میں سے ہر ایک نے مروان اور ابن ہبیرہ کی بڑی تعریفیں کیں۔ پھر ابن ہبیرہ سب سے ان کا حسب نسب پوچھنے لگا۔ تب میں ان لوگوں سے الگ ہو گیا، کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس گفتگو کا انجام خوشگوار نہیں ہو گا۔ مجھے امید تھی کہ مہمان بہت زیادہ باتیں کر کے اسے تھکا دیں گے اور معاملہ ختم ہو جائے گا لیکن اس نے ہر ایک سے اس کے نسب کے بارے میں پوچھا۔ حتیٰ کہ سب سے آخر میں اس نے مجھے اپنے پاس بلایا اور کہا: تم کن لوگوں میں سے ہو؟ میں نے جواب دیا: میرا تعلق یمن سے ہے۔ اس نے پوچھا: تمہارا قبیلہ کونسا ہے؟ میں نے جواب دیا: مذحج۔ اس نے کہا: صاف صاف بات کرو!

میں نے کہا: میں بنی حارث ابن کعب سے ہوں۔ وہ کہنے لگا: بھائی حارثی! لوگ کہتے ہیں کہ یمانیوں کا باپ میمون (بندر) ہے۔ تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟ میں نے کہا: اس چیز کی تحقیق کرنا مشکل نہیں ہے۔ ابن ہبیرہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا: تمہاری دلیل کیا ہے؟ میں نے کہا: تم میمون کی کنیت دیکھو، اگر اسے ابوالیمن کہتے ہیں تو یمانیوں کا باپ میمون ہے اور اگر اس کی کنیت ابو قیس ہے تو پھر وہ دوسروں کا باپ ہے۔ ابو ہبیرہ اپنی اس گفتگو سے بڑا پشیمان ہوا۔[1]

معاویہ بن ابوسفیان کے زمانے میں یہ نسلی تعصب اپنے نقطہ عروج پر پہنچ گیا۔ اب سوال یہ نہیں تھا کہ کون شخص زیادہ پرہیزگار رہے یا یہ کہ پرہیزگار ہے بھی یا نہیں؟ بلکہ سوال یہ تھا کہ اس وقت کون زیادہ طاقتور ہے، دلیری اور سخاوت میں زیادہ مشہور ہے اور مشکل وقت میں اپنے پاس پناہ لینے والے کی بہتر طور پر حفاظت کر سکتا ہے۔ جب معاویہ نے ابن حضرمی کو بصرہ کے لوگوں کو ورغلانے اور امام علیؑ کی اطاعت سے ہٹانے کے لیے اس شہر میں بھیجا تو اسے کہا: قبیلہ تمیم کے پاس جاؤ اور ازد اور ربیعہ کے قبیلوں سے دور رہو، کیونکہ وہ علیؑ کے حمایتی ہیں۔ ابن حضرمی نے ایسا ہی کیا اور زیاد نے جو ابن عباس کی جگہ بصرہ کا انتظام چلا رہا تھا، امام علیؑ کو ایک خط لکھا اور انہیں اس صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ امام علیؑ نے قبیلہ تمیم کے ایک آدمی کو ان لوگوں کے پاس بھیجا جنہوں نے ابن حضرمی کو پناہ دے رکھی تھی، لیکن انہوں نے اس آدمی کو قتل کر دیا۔

---

[1] الهفوات النادرہ صفحات ۱۳۱ - ۱۳۲

اس پر امام علیؑ نے ایک اور تمیمی کو جس کا نام جاریہ ابن قدامہ تھا ایک لشکر کے ساتھ بصرہ روانہ کیا۔ آخر کار جاریہ اور ابن حضرمی کے درمیان جنگ ہوئی۔ ابن حضرمی اور اس کے چند ساتھیوں نے ایک قلعے میں پناہ لی اور جاریہ نے انہیں زندہ جلا دیا۔ اس پر ازدیوں نے بنی تمیم کو ملامت کی کہ وہ اپنے پناہ لینے والے کی حفاظت نہیں کر سکے۔

جیسا کہ بنی ازد کے ایک شاعر نے کہا:

۱ــــ ہم نے تو زیاد کو اس کے گھر بھیج دیا اور بنی تمیم کے پاس پناہ لینے والا دھواں بن کر اڑ گیا۔

۲ــــ وہ لوگ بہت برے ہیں جنہوں نے اپنے پاس پناہ لینے والے کو بھون ڈالا، دو درہم کے بدلے ایک بھیڑ کی کھال اتار کر اسے بھونا جا سکتا ہے۔

۳ــــ جب اس کا سر آگ کے شعلوں کے ساتھ بھونا جا رہا تھا وہ ان ذلیل لوگوں کو اپنی مدد کے لیے پکار رہا تھا، تا کہ وہ اسے دم گھٹنے سے بچائیں۔

۴ــــ لیکن ہم (ازدی) لوگوں کی عادت یہ ہے کہ ہم اپنے پاس پناہ لینے والے کی مدد کرتے ہیں تا کہ اس پر ظلم نہ ہو۔

۵ــــ جب ہمارے پاس پناہ لینے والا ہمارے گھر آیا تو ہم نے اس کی مدد کی، یہ فقط خاندانی شرافت ہے جو ہم سے پناہ لینے والے کی حمایت کراتی ہے۔

۶ــــ تمیمیوں نے پناہ لینے والے کے حق کو نہ سمجھا، جبکہ پناہ لینے والوں میں وہ لوگ سب سے بہتر ہوتے ہیں جو اونچے خاندان کے ہوں۔

حدود اور قوانین کی پاسداری کا کوئی خیال نہیں جن کا رسول اکرمؐ نے حکم دیا تھا۔ حاکم کوفہ ابن زیاد جو خود کو امیرالمومنین کا نمائندہ سمجھتا تھا، نیز ابن سعد اور شمر میں سے کسی نے بھی اس بارے میں نہیں سوچا کہ بقول ان کے اگر امام حسین علیہ السلام اور ان کے ساتھی مسلمان نہیں اور ان سے جنگ کرنی چاہیے، تو پھر بھائی، بیٹے اور بھانجے، بھتیجے کسی کو بھی نہیں بخشنا چاہیے لیکن اگر وہ مسلمان ہیں تو بھی اس دینی حکم میں رشتہ دار اور غیر رشتہ دار برابر ہیں اور ان کا قتل کرنا جائز نہیں۔

پس ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اکرمؐ کی وفات کے بعد نصف صدی کے اندر اندر عرب اپنی پرانی جاہلیت کی طرف لوٹ گئے جیسے کہ اس سرزمین پر نہ تو کوئی مسلمان آیا اور نہ ہی اسلامی برادری کا کوئی وجود تھا۔ یہاں میں یہ بھی واضح کرنا چاہتا ہوں کہ جو کچھ اس باب اور دوسرے ابواب میں کہا گیا اور اس سے جو نتیجہ اخذ کیا گیا ہے وہ مسلمانوں کے معاشرے کی مجموعی تصویر ہے۔ جبکہ دوسری جانب یہ امر مسلم ہے کہ حجاز اور عراق کے گوشہ و کنار میں حتیٰ کہ معاویہ کی حکومت کے مرکز شام میں بھی ایسے باایمان پارسا اور باکردار مسلمان بھی موجود تھے جو اس اکثریت سے ہم آہنگی نہیں رکھتے تھے اور جو کچھ عام لوگ کرتے تھے اس سے انہیں دکھ ہوتا تھا۔ تاہم ان میں سے بیشتر گوشہ نشین ہو گئے اور اپنا وقت عبادت میں گزارتے تھے لیکن اگر وہ قدم آگے بڑھا کر دین کے فائدے کی بات کرتے بھی تھے تو کوئی ان کا کہا سننا اور ماننا ہی نہ تھا۔

مسلمانوں کی موروثی حکومت کا قیام

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ ۗ

بلاشبہ خدا لوگوں کو نہیں بدلتا جب تک وہ اپنے آپ کو نہ بدلیں۔ (رعد۔ آیت ۱۱)

ایک اور موضوع جس کے بارے میں یہاں گفتگو کرنی چاہیے اور جو نظام کو بدلنے اور زیر بحث زمانے بالخصوص سنہ ۴۰ ھ سے سنہ ۶۰ ھ تک کے آخری بیس سالوں میں اسلامی معاشرے کے سقوط میں دوسرے سب عوامل سے زیادہ مؤثر رہا ہے۔ وہ اسلام میں حکومت کا مسئلہ ہے۔ جس دن رسول اکرمؐ نے مدینہ کے لوگوں سے اپنا مشہور پیمان باندھا تھا" اس دن اسلام اپنی زندگی کے دوسرے مرحلے میں داخل ہو گیا۔ کیونکہ اس نے دینی ریاست کی شکل اختیار کر لی۔ جب تک رسول اکرمؐ مکہ میں رہے تھے، اسلام فقط

کے بعد بھی خلافت ان کے کسی بیٹے کو ورثے میں نہیں ملی۔ بلکہ عمر بن خطاب کو خلافت مل گئی جن کا تعلق بنی عدی کے قبیلے سے تھا۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ عمر بن خطاب کو ابو بکر بن قحافہ نے خلافت کے لیے نامزد کیا لیکن رسمی طور پر یہ عہدہ انہیں اس وقت حاصل ہوا جب مہاجرین اور انصار نے ابو بکر کے عمل کی تصدیق کر دی۔ جب عثمان بن عفان نے لوگوں کو ابو بکر کا خط دکھایا اور ان سے پوچھا کہ ابو بکر نے جس شخص کا نام اس خط میں لکھا ہے کیا تم اسے خلافت کے لیے قبول کرتے ہو؟ اس پر مہاجرین اور انصار کے سرداروں نے اسے قبول کر لیا۔

یوں ابو بکر اور عمر کے انتخاب کے سلسلے میں عام مسلمانوں کی رائے لی گئی۔ پھر عمر کے بعد بھی ان کے بیٹے کو خلافت ورثے میں نہیں ملی۔ بلکہ عمر بن خطاب نے جن چھ اشخاص کو شوریٰ کے ارکان کے طور پر نامزد کیا تھا، انہوں نے عثمان بن عفان کو منتخب کر لیا اور عام مسلمانوں نے بھی شوریٰ کی یہ رائے قبول کر لی۔

اسی طرح امام علیؑ کو بھی مہاجرین، انصار اور دوسرے مسلمانوں کی شوریٰ نے قتل عثمان کے روز اور دیگر چند دنوں کی کوشش اور سوچ بچار کے بعد خلافت کے لیے منتخب کر لیا۔ پس جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں رسول اکرمؐ کے بعد ایک چوتھائی صدی تک وہ لوگ اسلامی حاکم کا تقرر کرتے تھے جو اسلام میں سبقت اور دین کی راہ میں جہاد کی بنا پر مسلمانوں کی نگاہوں میں روحانی مقام رکھتے تھے اور ایک طرح سے دوسروں کی نمائندگی کرتے تھے۔ اس تمام عرصے میں امام علیؑ کہ جو شیعہ عقیدے کے مطابق رسول اکرمؐ کے بعد آئینی خلیفہ ہیں، وہ کلمۂ اسلام کی وحدت

کی خاطر اور عامۃ المسلمین کی فلاح و بہبود کو مدنظر رکھتے ہوئے دوسروں کے ساتھ ہم آہنگ تھے۔ اپنے حکمران کے انتخاب کا یہ حق مسلمانوں کے لیے اس قدر فطری اور مسلم گردانا جاتا تھا کہ اگر خلیفہ مفاد عامہ کا خیال نہ رکھتا ہو تو وہ اپنے آپ کو اس کی بیعت توڑ دینے کا مجاز سمجھتے تھے۔

وہ جنگ صفین کا موقع تھا جب مسلمانوں میں پہلی بدعت ظاہر ہوئی ـــــ ایک ایسی بدعت کہ جس کے انجام پر اس کے طرفداروں نے چنداں غور نہیں کیا، اگر غور کیا بھی تھا تو وہ اس کے ضرر کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکے ـــــ جب معاویہ بن ابوسفیان نے دیکھا کہ امام علیؑ کی سپاہ کے مقابلے میں اس کی شکست یقینی ہے تو اس نے اپنی مشہور چال چلی ـــــ یعنی قرآن نیزوں پر بلند کیا اور اہل عراق سے کہا کہ وہ خدا کی کتاب کا فیصلہ قبول کریں۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، اس وقت امام علیؑ نے حتی المقدور اپنے ساتھیوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ معاویہ اور ابن عاص نے نہ کبھی قرآن کا فیصلہ چاہا اور نہ اب چاہتے ہیں۔ انھوں نے یہ چال اس لیے چلی ہے کہ وہ جنگ میں اپنی یقینی شکست دیکھ رہے ہیں۔ تاہم انھوں نے آپ کی بات نہیں مانی اور آخر کار آپ کو مجبور کیا کہ معاویہ کی دعوت کا مثبت جواب دیں۔ یہ ایک ایسی بات تھی جس کا معاویہ کو قطعاً کوئی حق نہیں تھا۔

نص پیغمبر اور حق امامت سے قطع نظر امام علیؑ کو مہاجرین اور انصار کی شوریٰ نے حکومت کے لیے منتخب کیا تھا۔ جبکہ ابوبکر، عمر اور عثمان کے عہد سے یہ حق مہاجرین اور انصار کو حاصل تھا اور شام سمیت دوسرے علاقوں کے لیے لازم تھا کہ وہ اس فیصلے کو قبول کریں لیکن معاویہ نے

امامِ وقت کی بیعت سے سرتابی کی اور پھر ان کے خلاف جنگ کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ قرآن کے حکم کے مطابق اس وقت کے مسلمانوں پر لازم تھا کہ وہ معاویہ کے خلاف جنگ کریں، حتیٰ کہ وہ اطاعت قبول کرے۔ کیونکہ وہ مسلمان نہ تو حاکم کے تعین کے بارے میں شک میں مبتلا تھے کہ قرآن مجید ان کا شک دور کرتا اور نہ وہ اس بات کا حق رکھتے تھے کہ ابن عاص اور ابوموسیٰ اشعری کو وکیل مقرر کریں، تاکہ وہ دیکھیں کہ ان کے منتخب کردہ حاکم میں اس عہدے پر فائز رہنے کی صلاحیت ہے یا نہیں؟ لیکن حقیقت یہ ہے کہ امام علیؑ کی سپاہ کے ایک گروہ کے لوگ بظاہر ان کے ساتھ تھے اور در پردہ معاویہ کے ساتھ ساز باز رکھتے تھے۔

ایک دوسرا گروہ اس اکثریت پر مشتمل تھا جو آپ کے گرد جمع ہو گئی تھی، اس کی کیفیت کچھ یوں تھی:

یہ لوگ صحیح منطق سے بے بہرہ تھے یا انہیں کسی منطق سے کوئی غرض نہ تھی۔ یہ ایسے لوگ تھے جو وقتی احساسات کا شکار ہو جاتے ہیں، سازشیں کرتے ہیں، اکسائے جا سکتے ہیں اور وہ خود غرض اور ضدی ہوتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ کسی چیز کو کیوں قبول کرتے ہیں، کیوں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، کیوں پشیمان ہوتے ہیں اور از سرِ نو کیا چاہتے ہیں اور کیوں چاہتے ہیں؟ شاید ساری دنیا میں بہت کم لوگ ایسے ملیں گے جو یوں بدل جاتے ہوں اور اتنی سرعت سے ایک نیا ارادہ کرتے ہوں۔ یعنی ایک شخص کوئی بات سنتا ہے اور اس کے ماخذ کو جانے بغیر دوسرے سے کہتا ہے اور وہ کسی اور سے کہتا ہے۔ حتیٰ کہ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرتا کہ ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگ ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو جاتے ہیں اور ایک

فساد کھڑا کر دیتے ہیں اور جب فساد برپا ہو جاتا ہے تو جلدی سے پشیمان ہوتے ہیں کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا۔ اس سے بھی بدتر یہ بات کہ وہ ایسے حادثے سے کوئی نصیحت حاصل نہیں کرتے اور تھوڑی ہی مدت میں اسی طرح کا ایک اور ہنگامہ کھڑا کر دیتے ہیں۔ اس نصف صدی میں ان لوگوں کی تاریخ میں ایسے بہت سے مواقع دیکھنے میں آتے ہیں۔

ان لوگوں نے امام علیؑ کو معاویہ کی تجویز قبول کرنے پر مجبور کیا لیکن جب ان کے ثالث ابوموسیٰ اشعری نے امام علیؑ کو خلافت سے معزول کیا اور شام کے ثالث عمرو بن عاص نے معاویہ کو خلافت کے لیے نامزد کر دیا، تب وہ سمجھے کہ انہوں نے بہت دھوکا کھایا ہے۔ اب وہ نئے سرے سے اس کوشش میں لگ گئے کہ معاویہ کی سرکوبی کے لیے قوت فراہم کریں۔ لیکن پانی سر سے گزر چکا تھا اور وہ ہرگز اس قابل نہ ہوئے کہ پھر سے تازہ فوج تیار کر سکیں۔ یوں معاویہ ایک ایسی وکالت کے ذریعے جس کے مقدمات بھی درست نہ تھے حکومت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کی حکومت اس کے پیشروؤں میں سے کسی کی حکومت کے مانند نہ تھی۔ اس کی خلافت پر مہاجرین و انصار نے رضامندی ظاہر نہ کی تھی، نیز مصر اور حکومت اسلامی کے ماتحت دوسرے صوبوں نے بھی اسے قبول نہ کیا تھا۔

معاویہ اور اس کا باپ ان لوگوں میں سے تھے، جن سے عمر بن خطاب کو مسلمانوں کے بارے میں ہمیشہ پریشانی لاحق رہتی تھی۔ پھر بھی انہوں نے معاویہ کو شام کا گورنر مقرر کر دیا۔ تب معاویہ کی ماں نے اسے کہا: "دیکھو! اس شخص (خلیفہ عمر) نے تمہیں ایک عہدہ دیا ہے۔ اس لیے وہ کام کرنے کی کوشش کرو کہ جو وہ چاہتا ہے نہ کہ وہ جو تم خود چاہتے ہو۔ پھر وہ اپنے باپ ابوسفیان

کے پاس گیا تو اس نے اسے کہا: "یہ مہاجر (خلیفہ عمر) ہم سے پہلے مسلمان ہوئے، ہم ان کے بعد اس دین میں داخل ہوئے اور پیچھے رہ گئے۔ اب وہ ہمارے سردار ہیں اور ہم ان کے تابع ہیں۔ ستو کہ انہوں نے تمہیں ایک اہم عہدہ دیا ہے، اس لیے احتیاط برتنا کہ تم ان کے خلاف نہ جاؤ کیونکہ تم اس کے نتیجے کو نہیں سمجھ سکتے۔" اس وقت معاویہ اپنے باپ اور اپنی ماں کی باتیں سن کر حیران رہ گیا، کیونکہ گو ان کے الفاظ مختلف تھے لیکن ان کا مطلب ایک ہی تھا۔[1]

بعد میں جب خلیفہ عمر شام گئے تو خود خلیفہ اور عبدالرحمٰن ابن عوف دونوں گدھے پر سوار تھے۔ تب معاویہ بڑے تزک و احتشام کیساتھ سامنے سے آیا اور عمر بن خطاب کے پاس سے گزر گیا اور انہیں پہچانا نہیں۔ پھر اسے بتایا گیا کہ یہ شخص جو گدھے پر سوار تھا وہ خلیفہ عمر ہیں تو وہ لوٹا اور پا پیادہ ہو گیا لیکن عمر بن خطاب نے اس کی طرف توجہ نہ کی اور معاویہ ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ تب عبدالرحمٰن نے عمر بن خطاب سے کہا: تم نے تو معاویہ کو تھکا دیا ہے۔ اس وقت خلیفہ عمر نے اسے مخاطب کیا اور کہا: "اے معاویہ! تم یہاں اس خدم و حشم کے ساتھ چلتے ہو؟ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ لوگ تمہارے گھر کے دروازے پر اس انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں کہ تم انہیں اندر آنے کی اجازت دو۔" معاویہ نے جواب دیا: "اے امیر المومنین! ایسا ہی ہے۔"

عمر بن خطاب نے پوچھا: "کیوں؟"

اس نے جواب دیا: "ہم ایک ایسی سرزمین میں ہیں جس میں دشمن

---

[1] عقد الفرید جلد ۵ صفحہ ۱۰۷

کے جاسوس رہتے ہیں۔ ہمیں ان کے سامنے اس طرح رہنا چاہیے کہ وہ ہمارے کروفر سے مرعوب رہیں اور ہم سے ڈریں، لیکن اگر آپ حکم دیتے ہیں تو میں اس روش کو ترک کر دیتا ہوں"۔

خلیفہ نے کہا: "جو کچھ تم نے کہا، اگر سچ ہے تو یہ ایک عاقلانہ جواب ہے اور اگر جھوٹ ہے تو یہ ایک عاقلانہ فریب ہے"۔ [1]

اس مختصر سی گفتگو سے معاویہ کی ذہنیت اور حکومت و سربراہی کے بارے میں اس کے نظریے کا پتا چل جاتا ہے۔ جو چیز وہ چاہتا تھا اور اسے حاصل ہو گئی وہ خود مختار حکومت اور بادشاہی تھی، وہ مسلمانوں کے معاشرے کی سربراہی نہیں تھی۔

۴۰ھ میں امام علیؑ کے شہید ہو جانے سے سابقہ نظامِ حکومت اور اس کے لائحہ کار کے احیا و تجدید کی امید ختم ہو گئی اور پھر امام حسنؑ ابن علیؑ کی معاویہ سے صلح کے سانحہ سے بنی امیہ کی ایک دیرینہ آرزو پوری ہو گئی۔ معاویہ نے اپنی حکومت کے پہلے دس سالوں میں یہ منصوبہ بنایا کہ وہ لوگوں کی طرف سے حکومت کے انتخاب کا اصول ختم کر ڈالے اور اس بارے میں مسلمانوں کی رائے کو قطعی طور پر نظر انداز کر دے۔ چنانچہ عوام کی رائے کے مطابق ایک خلیفہ (علیؑ) کے انتخاب کو ابھی بیس سال بھی نہیں گزرے تھے کہ معاویہ نے مسلمانوں میں ولی عہدی کی بدعت رائج کر دی۔ یہ ایک ایسی بدعت تھی جس نے اسلامی نظام حکومت کو بالکل الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ یوں مسلمانوں کے حاکم کا تقرر ایک ایسی بنیاد پر ہوا جس میں خدا کے قانون یا لوگوں کی رضا مندی کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔ گویا ابھی رسول اکرمؐ کی وفات کو چالیس سال سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ زمانۂ جاہلیت

---

[1] عقد الفرید جلد ۵ صفحہ ۱۰۸

کی ایک اور رسم زندہ ہوگئی۔ جیسا کہ قبائلی نظام میں رسم ہے کہ جب کسی قبیلے کا شیخ مرتا ہے تو اس کا بڑا بیٹا اس کی جگہ لے لیتا ہے اور معاویہ نے اسی رسم کو زندہ کر دیا تھا۔

ابن عبدربہ نے لکھا ہے کہ اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کی ابتدا ۵۴ھ میں ہوئی، لیکن ابن اثیر نے اس بارے میں جو تفصیل لکھی ہے وہ حقیقت کے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے۔ جیسا کہ وہ کہتا ہے:

"مغیرہ ابن شعبہ نے سنا کہ معاویہ اسے کوفہ کی حکومت سے ہٹا کر وہاں سعید ابن عاص کو مقرر کرنا چاہتا ہے تو وہ یزید کے پاس شام گیا اور اسے کہنے لگا: رسول اکرمؐ کے جلیل القدر صحابی اور قریش کے رئیس سبھی مر گئے اور ان کی جگہ ان کے فرزندوں نے سنبھالی۔ اسی طرح معاویہ کو بھی ایک دن مرنا ہے" تو پھر تم اس کی جگہ کیوں نہ لو؟ تم کسی دوسرے کے فرزندوں سے کس لحاظ سے کمتر ہو؟ بلکہ تم تو سب سے بہتر ہو۔ تمہارا باپ تمہارے لیے لوگوں سے بیعت کیوں نہیں لیتا؟

یزید جو اگر پہلے سے ایسا خیال رکھتا بھی تھا تو اس کا حقیقت کی شکل اختیار کرنا محال سمجھتا تھا، کہنے لگا: کیا تمہارا خیال ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے؟

اس نے جواب دیا: "ہاں!"

مغیرہ بن شعبہ کی بات سن کر یزید معاویہ کے پاس گیا اور اسے سارا ماجرا سنایا۔ اس پر معاویہ نے مغیرہ کو طلب کیا اور کہا: "یہ کام کون انجام دے سکتا ہے؟"

مغیرہ نے جواب دیا: کوفہ کا میں اور بصرہ کا ذمہ زیاد لیتا ہے جب

یہ دو شہر بیعت کر لیں گے تو پھر کوئی مخالفت نہیں کرے گا۔ معاویہ نے کہا: تم اپنے منصب پر واپس جاؤ۔

مغیرہ نے واپس کوفہ پہنچ کر بنی امیہ کے کچھ حمایتیوں کو بلایا انہیں بہت سارو پیہ دیا اور انہیں اپنے بیٹے کی سرکردگی میں معاویہ کے پاس بھیجا تاکہ وہ اسے کہیں کہ آپ یزید کو اپنا ولی عہد مقرر کر دیں۔ جب وہ لوگ شام پہنچے تو معاویہ نے کہا: اس کام میں جلدی نہ کرو۔

پھر اس نے مغیرہ کے بیٹے سے پوچھا: تمہارے باپ نے ان لوگوں کا دین کتنے میں خریدا ہے؟

اس نے جواب دیا: ہر ایک کا تیس ہزار درہم میں!

معاویہ نے کہا: اس نے بہت سستا خریدا ہے۔[1]

اس سازش کے علاوہ بھی معاویہ سات سال تک اس مقصد کے لیے زمین ہموار کرتا رہا۔ اس نے سربرآوردہ صحابہ میں سے ہر ایک کے ساتھ گفتگو کی تاکہ یہ معلوم کریں کہ وہ کس حد تک اس کے خیال کی تائید کرتے ہیں اور کس حد تک اس کی مخالفت کریں گے۔ اس نے عبداللہ ابن زبیر سے پوچھا: تم یزید کے حاکم بننے کے بارے میں کیا کہتے ہو؟

اس نے جواب دیا: میں چوری چھپے نہیں، بلکہ کھلم کھلا کہتا ہوں! اس سے پیشتر کہ تم کو پشیمان ہونا پڑے، خوب سوچو، اچھی طرح دیکھو اور پھر قدم آگے رکھو، کیونکہ لازم ہے کہ انسان قدم بڑھانے سے پہلے دیکھے اور پشیمان ہونے سے پہلے سوچے!

---

[1] الکامل جلد ۳ صفحہ ۵۰۳

معاویہ ہنسا اور کہنے لگا: تم مکار لومڑی ہو اور تم نے بڑھاپے میں سجع سیکھا ہے، لیکن اس لمبے چوڑے سجع کی ضرورت نہیں ہے۔ [1]

جب معاویہ نے اس بارے میں احنف بن قیس کا نظریہ معلوم کرنا چاہا تو وہ خاموش رہا۔

معاویہ نے پوچھا: تم خاموش کیوں ہو؟

اس نے جواب دیا: اگر میں سچی بات کہوں تو تم سے ڈرتا ہوں اور اگر جھوٹ بولوں تو خدا سے ڈرتا ہوں۔

۵۵ھ میں معاویہ نے بڑے بڑے شہروں کے لوگوں کو خط لکھے اور انہیں کہا کہ وہ یزید کے حاکم مقرر کیے جانے میں مشورے کے لیے اپنے نمائندے دمشق بھیجیں۔ پھر ان نمائندوں نے جو کچھ کہا اس سے پتا چلتا ہے کہ اس سال تک مسلمانوں کا معاشرہ اسلام کے اصولوں سے کس قدر دُور ہو چکا تھا یا کم از کم اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان نمائندوں نے کس طرح دنیاوی منفعت کی خاطر اپنا دین دوسروں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ ان نمائندوں کے جوابات میں سے وہ واحد جواب کہ جس سے تھوڑی بہت مخالفت کی ہوا آتی ہے وہ مدینے کے نمائندے محمد بن عمرو بن حزم کا جواب تھا جس نے کہا:

"یزید ایک مالدار اور درمیانی قابلیت کا آدمی ہے۔ خدائے تعالےٰ ہر حاکم سے لوگوں کے ساتھ اس کے سلوک کے بارے میں بازپرس کرتا ہے۔ تم خدا سے ڈرو اور دیکھو کہ کس شخص کو محمد رسول اللہ ؐ کی

---

[1] عقد الفرید جلد ۵ صفحات ۱۱۰ - ۱۱۱

امت کا امیر بنا رہے ہو۔"

معاویہ نے کہا: "تم نصیحت کرنے والے ہو اور تم نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔" مگر اس نے اپنی بات ان الفاظ کے ساتھ ختم کی:

"میرے بیٹے اور ان (بنی ہاشم) کے سوا کوئی باقی نہیں رہا۔ میں ان کے بیٹوں کے مقابلے میں اپنے بیٹے کے ساتھ زیادہ محبت کرتا ہوں پس تم میرے ہاں سے چلے جاؤ۔"

وہ پہلا شخص جس نے معاویہ کے دل کی بات ظاہر کر دی، وہ شام کا داروغہ ضحاک بن قیس تھا۔ اس نے یزید کے علم، حلم اور نیک سیرتی کی تعریف کی اور کہا: وہ سب سے بڑھ کر ہماری حفاظت کا سامان مہیا کرتا ہے۔ یہ سن کر دوسرے بھی سمجھ گئے کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے یزید کی وہ صفات بیان کیں جو اس میں نہیں تھیں اور ان خرابیوں کو ڈھونڈا جو اس میں تھیں۔ گویا حقیقت پر پردہ ڈالنے اور دین بیچنے میں مقابلے کا بازار اپنی انتہا تک گرم ہو گیا۔

یزید بن مقنع اٹھا اور اس نے معاویہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "امیر المومنین یہ ہیں اور اگر یہ مر جائیں تو یہ ہیں۔" اس کے ساتھ اس نے یزید کی طرف اشارہ بھی کیا۔ پھر اپنی تلوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "اگر کوئی اس بات کو قبول نہ کرے تو پھر یہ ہے۔"

معاویہ نے کہا: "بیٹھ جاؤ! تم خطیبوں کے سردار ہو۔"

جب مروان نے معاویہ کے حکم سے مدینہ کے لوگوں سے یزید کے لیے بیعت لینا چاہی تو اس نے کہا: "اس معاملہ میں معاویہ نے ابوبکر بن قحافہ کی روش پر عمل کیا ہے۔"

اس بڑے جھوٹ کا جو واحد ردعمل ظاہر ہوا وہ یہ تھا کہ ابوبکر کے بیٹے عبدالرحمٰن نے مسجد کے ایک کونے سے چلا کر کہا: "یہ تم جھوٹ کہتے ہو! ابوبکر نے تو اپنے بیٹوں اور رشتہ داروں کو چھوڑ کر بنی عدی کے ایک شخص کو مسلمانوں کا سربراہ بنایا تھا۔"

مروان کو خوف ہوا کہ عبدالرحمٰن کی بات کہیں اور لوگوں کو متاثر نہ کر دے کیونکہ پہلے خلیفہ کا بیٹا ہونے کی وجہ سے اس کی باتوں کا لوگوں پر اثر ہو سکتا تھا۔ تاہم جو کچھ اس نے کہا مروان اس سے انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ جواب میں اس نے قرآن مجید کی فقط یہ آیت پڑھی:

وَالَّذِیْ قَالَ .... مِنْ قَبْلِیْ

اور جس نے اپنے ماں باپ سے کہا کہ تمہارا برا ہو، کیا تم مجھے دھمکی دیتے ہو کہ میں دوبارہ (قبر سے) نکالا جاؤں گا۔ حالانکہ مجھ سے پہلے صدیاں گزر چکی ہوں گی۔

(احقاف- آیت ۱۷)

اگر مروان نے اس اجتماع میں ایسا جھوٹ بولا تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کیونکہ اس وقت ابوبکر کو فوت ہوئے چالیس سال سے زیادہ مدت گزر چکی تھی۔ جن لوگوں سے مروان مخاطب تھا وہ ابوبکر کی وفات کے وقت یا تو پیدا ہی نہیں ہوئے تھے یا نوخیز لڑکے تھے جو اس بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ غالباً وہ تقریباً سب کے سب اس بات سے ناواقف تھے کہ مسلمانوں کی حکومت کے سلسلے میں وراثت کوئی خصوصیت شمار نہیں کی جاتی۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ

خلیفہ کے انتخاب میں خدا کے حکم اور عامتہ المسلمین کی رائے کو بھی ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے۔

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ سنہ ۶۱ھ میں کامل اکثریت ان لوگوں کی تھی جو عثمان کے عہد میں پیدا ہوئے۔ امام علیؑ کے دور کے آخر میں جوانی کو پہنچے اور معاویہ کے زمانے میں عملی طور پر معاشرے میں داخل ہوئے۔ جس طرح معاویہ نے حکومت حاصل کی تھی، ان کے ذہنوں میں دھندلی سی یاد باقی تھی اور یزید کو حکومت ملنے کے وہ خود شاہد تھے۔ شاید ان لوگوں کے لیے یہ بات کسی حد تک فطری معلوم ہوتی تھی کہ یزید کی جو مخالفت بھی کی جائے وہ اسے اسلامی معاشرے کو تباہ کرنے کے مترادف سمجھیں۔

یزید کی زندگی کے بارے میں جو کچھ میں جانتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس کی تربیت ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔ یہ بڑا مشہور واقعہ ہے کہ ایک دن یزید کی ماں کہہ رہی تھی: مجھے ادنی عبا پہننا اور خیمے میں رہنا محل میں رہنے اور ریشم کے کپڑے پہننے سے زیادہ پسند ہے۔ معاویہ نے اس کا کلام سنا تو اسے اس کے بیٹے یزید سمیت اس کے قبیلے میں بھیج دیا۔ یزید نے وہاں بیابانی تربیت حاصل کی۔ اس نے نہ کچھ پڑھا لکھا اور نہ کوئی کمال حاصل کیا۔ چونکہ اس نے صحرانشینوں کے درمیان پرورش پائی اس لیے وہ روانی سے بول سکتا تھا اور اچھے اشعار کہتا تھا۔ وہ اشعار جو اس سے منسوب کیے گئے ہیں ان کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں سے کونسے اس نے کہے ہیں۔ کیونکہ ان میں سے کئی ایک ایسے ہیں جن کا اس سے منسوب کرنا درست نہیں معلوم ہوتا۔ تاہم تین چار اشعار کہ جو غالباً خود اس نے کہے ہیں، ان میں سلاست اور

روانی پائی جاتی ہے۔

علاوہ ازیں اس کا ایک خطبہ بھی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اس نے حاکم بننے کے بعد مسجد دمشق میں دیا تھا۔ گو وہ خطبہ بہت مختصر ہے لیکن زوردار اور فصیح ہے۔ گویا کہ یہی شعر گوئی وہ واحد ہنر ہے جو اس نے حاصل کیا تھا۔ نیز جیسا کہ کہا جاتا ہے وہ صحرائی زندگی بسر کرنے کے باعث گھڑسواری اور شمشیر زنی بھی جانتا تھا لیکن جو چیز وہ نہیں جانتا تھا، وہ آداب مسلمانی اور اسلامی فقہ تھی۔ اس کی امام علیؑ بن الحسینؑ سے گفتگو ــــ بشرطیکہ ہوئی بھی ہو ــــ اس سے پتا چلتا ہے کہ اسے قرآن مجید کی کچھ آیات بھی یاد تھیں لیکن پھر بھی سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ تقویٰ سے بے بہرہ تھا کہ جو خلافت کا لازمہ ہے۔ جبکہ آسائش کی زندگی کے ساتھ ساتھ شکار، شراب اور سگ بازی نے اسے عیاش، ہوس پرست اور لاابالی بنا دیا تھا۔ افسوس ہے کہ معاویہ کی بیس سالہ حکومت میں اس کی خود غرضی کو دیکھ کر لائق اور دیندار لوگ اس سے الگ ہو گئے تھے۔ حتیٰ کہ اس کی حکومت کی دوسری دہائی میں اسکے مصاحبوں نے خواہ اپنی خاندانی حمیت کی بنا پر یا اپنے عہدے کی حفاظت کی خاطر اسکو مشورہ دینا چھوڑ دیا تھا، وہ کسی کو بھی اس کا موقع نہیں دیتے تھے کہ وہ اسکے سامنے سچی بات کہہ سکے۔ چنانچہ یزید جب حوارین[1] سے دمشق واپس آیا تو وہ اپنی خوشامدی، غیر مستقل مزاج، نادان اور بے دین لوگوں میں گھرا ہوا تھا۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ اگر اسے زیاد اور مغیرہ جیسے مشیر میسر آجاتے تو یقیناً وہ اپنی حکومت کے ابتدائی دنوں میں مدینہ کے حاکم کو ایسا سخت خط نہ لکھتا کہ جس کے نتیجے میں کربلا ایسے دردناک واقعات پیش آئے۔

1۔ شام میں واقع ایک قلعہ کا نام

امام علیؑ سے سرمایہ داروں کا ٹکراؤ

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ
لوگوں نے اپنے ہاتھوں سے جو کچھ کیا اس کی بدولت
خشکی اور تری میں فساد پھیل گیا۔

(روم۔ آیت ۴۱)

ابھی عثمان بن عفان کی حکومت کے چند سال بھی نہیں گزرے تھے کہ صوبائی حکومتیں خود مختار ہونے لگیں۔ اس کے علاوہ مروان ابن حکم کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ دراصل وہی خلیفہ کے اختیارات رکھتا تھا۔ وہ جو کچھ کرتا یا تو خلیفہ کو اس کی خبر ہی نہیں ہوتی تھی اور اگر ہو بھی تو وہ کچھ کر نہیں سکتا تھا، گویا وہی ہوتا کہ جو کچھ مروان چاہتا تھا۔ خلیفہ عثمان کے دور میں جو شورشیں برپا ہوئیں، میں ان کا ذکر نہیں کرنا چاہتا کیونکہ اس طرح بات لمبی ہو جائے گی۔ تاہم ایک نکتے کا ذکر کرنا لازم ہے وہ

یہ کہ مسلمانوں کی اجتماعی اور اقتصادی حالت جو عمر بن خطاب کی خلافت کے آخر میں بگڑ گئی تھی اور انہوں نے اسے سدھارنا چاہا تھا، وہ عثمان بن عفان کے آخری سالوں میں اور بھی بدتر ہو گئی تھی۔

خلیفہ عمر کی بنائی ہوئی شوریٰ کی آخری ساعتوں میں جب عبدالرحمٰن ابن عوف نے عثمان سے یہ عہد لیا کہ اگر خلافت اسے مل گئی تو وہ خدا کی کتاب، سنتِ رسولؐ اور سیرتِ شیخین (ابوبکر و عمر) کے مطابق عمل کرے گا اور عثمان نے ان شرائط کو قبول کر لیا۔ اگر عثمان کی عمر اس وقت بیس سال کم ہوتی یا ان کے رشتہ داران کے امور پر حاوی نہ ہوتے یا وہ ان کی خواہشات کا مقابلہ کر سکتے تو شاید وہ اپنے اس وعدے پر عمل کرتے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابھی چند سال بھی نہیں گزرے تھے کہ معاشرہ اقتصادی عدم توازن اور گروہی تصادم کی جانب چل پڑا۔ جبکہ یہ بات بھی مسلم تھی کہ گزشتہ طریقہ عمل کو زندہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ وہ لوگ جنہیں مفت خوری، تن پروری اور دوسروں کے حقوق غصب کرنے کی عادت پڑ گئی اور جنہیں ایسی دولت مل گئی تھی جس پر وہ کوئی حق نہیں رکھتے تھے، اب ان کی حق شناسی کی طرف واپسی کا کوئی امکان باقی نہیں رہا تھا۔ یہ تصادم عثمان بن عفان کی خلافت کے ابتدائی سالوں میں ٹھیک طرح سے نظر نہیں آیا لیکن آہستہ آہستہ اس کی نشانیاں ظاہر ہونے لگیں۔ تاہم یہ نشانیاں خلافت کے مرکز میں ظاہر نہیں ہوئیں کیونکہ مدینہ کو بہر حال پرسکون رکھا گیا۔ انقلاب کا سیلاب پہلے مغربی علاقوں میں، پھر مشرقی علاقوں اور حجاز تک پھیل گیا۔ حتیٰ کہ خلافت کے مرکز — مدینہ — تک جا پہنچا اور مسلمانوں کے خلیفہ کو نگل گیا۔

وہ انقلابی جب خلیفہ کے قتل سے فارغ ہو گئے تو انہیں خیال آیا کہ مسلمانوں کی وسیع مملکت کا نظام چلانے کے لیے ایک حاکم کی ضرورت ہے۔ اس وقت جلیل القدر صحابہ میں سے وہ شخص جسے مسلمانوں کی اکثریت قبول کرے، امام علیؑ کے علاوہ کوئی نہ تھا اس لیے مدینہ کے لوگوں اور خود انقلابیوں نے بھی ان کی خلافت تسلیم کر کے ان کی بیعت کر لی۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں یہ صحیح طور پر معلوم نہیں ہے کہ آیا ان لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر اسی دن بیعت کی کہ جس دن ہنگامہ فرو ہوا یا اس کے ایک دو دن بعد کی تھی۔ ہاں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ امام علیؑ کے خلیفہ منتخب ہونے کے لیے ۳۵ھ سے زیادہ کوئی سال غیر موزوں نہ تھا۔ تب رسول اکرمؐ کے وصال کو ایک چوتھائی صدی کی مدت گزر چکی تھی۔

اس دوران میں ان کی بہت سی سنتیں ختم ہو چکی تھیں۔ دین کے راہِ راست کی جگہ سازشوں پر مبنی سیاست نے لے لی تھی اور امام علیؑ کو ایسی سیاست سے کوئی غرض نہ تھی۔ جن لوگوں کا سیاست سے تعلق تھا، وہ آپ کے کردار کو بخوبی جانتے تھے اور اس وقت جو چیز وہ نہیں چاہتے تھے وہ حقیقی انصاف تھا۔ امام علیؑ ان مشکلات کو دوسروں کی نسبت بہتر طور پر سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ فرما رہے تھے: بہتر یہ ہے کہ میں تمہارا امیر بننے کی بجائے تمہارا مشیر بن جاؤں۔

جن لوگوں نے کثیر دولت جمع کر لی تھی اور ایسے رتبوں پر پہنچے ہوئے تھے کہ جن کے وہ قابل نہیں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی دولت اور رتبے برقرار رہیں، جبکہ امام علیؑ کو یہ صورت حال قبول نہ تھی۔ وہ اجتماعی نظام کو رسول اکرمؐ کے زمانے کی طرف لوٹانا چاہتے تھے لیکن ان کی

اس آرزو کا پورا ہونا مخدوش نظر آتا تھا کیونکہ اس پچیس سال کی مدت میں اسلامی معاشرے میں بنیادی تبدیلیاں آگئی تھیں۔ امام علیؑ اس وقت حکومت لینا نہیں چاہتے تھے لیکن مسلمانوں نے جمع ہو کر آپ سے حکومت قبول کرنے کا تقاضا کیا اور یوں ظاہراً آپ پر حجت تمام کر دی۔ ادھر امام علیؑ بھی ایسے شخص نہیں تھے کہ ایسے موقع پر اپنے آرام کو مسلمانوں کی خواہش پر ترجیح دیں۔ اس لیے انہوں نے خلافت قبول کر لی لیکن چند ابتدائی ایام میں ہی معلوم ہو گیا کہ طبقۂ اشراف کا نئے خلیفہ سے کوئی سمجھوتہ ہونا محال ہے۔ کیونکہ وہ طبقہ حکومت کے کاروبار کو سیاست کی آنکھ سے دیکھتا تھا اور امام علیؑ اسے دین کی نظر سے دیکھتے تھے۔ عثمان بن عفان کے قتل ہو جانے کے بعد جن لوگوں نے امام علیؑ کے ہاتھ پر بیعت کی ان میں ایسے اشخاص بھی تھے جو دل سے آپ کی خلافت کے خواہاں نہیں تھے، بلکہ وہ انقلابیوں کے خوف یا دوسری وجوہ کی بنا پر آپ سے وابستہ ہو گئے تھے۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کے نزدیک اس بات کا کوئی احتمال نہ تھا کہ امام علیؑ خلیفہ عثمان کے رائج کیے ہوئے بارہ سال کے طور طریقے ختم کر دیں گے، انہیں امید تھی کہ نئے خلیفہ کی حکومت میں بھی انہیں سابقہ امتیازات حاصل رہیں گے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ نئے خلیفہ اتنے پرہیزگار اور سخت گیر ہیں کہ اپنے نزدیک ترین رشتہ داروں کو بھی معاف نہیں کرتے۔ پھر جب بصرہ اور صفین کی جنگیں ہوئیں اور مسلمانوں میں نااتفاقی پیدا ہو گئی تو یہ لوگ اپنی خاص ذہانت کی بدولت سمجھ گئے کہ آئندہ کامیابی معاویہ کو حاصل ہو گی۔ چنانچہ انہی دنوں سے انہوں نے معاویہ سے خط و کتابت شروع کر دی اور اس کی بخششوں سے بہرہ مند ہونے لگے۔

چنانچہ معاویہ یہ خطوط شام کے لوگوں کو دکھاتا اور کہتا: "عراق کے لوگ اپنے حالات سدھارنے کے لیے مجھ سے درخواست کرتے ہیں کہ میں وہاں جاؤں"۔

امام علیؑ کی شہادت کے بعد معاویہ نے ان کے فرزند امام حسنؑ کے ساتھ جو صلحنامہ مرتب کیا اس میں اس نے عہد کیا تھا کہ وہ لوگوں کے ساتھ عادلانہ سلوک کرے گا۔

اس سے مراد خصوصاً عراقیوں کے ساتھ عادلانہ سلوک تھا، کیونکہ مصر اور شام کا انتظام تو پہلے ہی سے اس کے گورنروں کے ہاتھ میں تھا، لیکن جب امام حسنؑ عراق سے حجاز چلے گئے تو معاویہ نے عراقیوں پر سختی شروع کر دی۔ حتیٰ کہ اس کے قول یا امان نامے پر کسی کو کچھ بھی اعتماد نہ رہا۔ پھر معاویہ نے امام علیؑ کے چند دوستداروں کو بڑی بے رحمی سے قتل کرا دیا جنہیں بڑے پرزور امان نامے دے رکھے تھے۔

جب عراقیوں نے دیکھا کہ انہوں نے اہل شام سے ایک بار پھر دھوکا کھایا ہے تو وہ بے حد آزردہ ہوئے۔ تب انہوں نے اپنے نمائندے مدینہ بھیجے تاکہ امام حسنؑ سے درخواست کریں کہ وہ معاویہ سے جنگ کرنے پر آمادہ ہو جائیں لیکن امام حسنؑ جانتے تھے کہ اس عظیم کام کے لیے جس ثابت قدمی کی ضرورت ہے، عراق کے لوگ اس سے عاری ہیں۔ لہٰذا آپ نے ان لوگوں سے کہا کہ اس طرح کے قیام کا یہ موقع نہیں ہے۔

امام حسنؑ بن علیؑ کو ۵۰ھ میں زہر دے دیا گیا، جس سے انکی شہادت واقع ہو گئی۔ اس سال کے بعد امویوں یا وسیع تر معنوں میں مضریوں نے بڑے بڑے اسلامی شہروں کا انتظام سنبھال لیا۔ معاویہ کی زندگی کے آخری دس سالوں میں عراقیوں پر سختی اور بڑھ گئی۔ حتیٰ کہ جب کبھی اس علاقے

کے نمائندے معاویہ کے پاس گئے۔ اس نے ان کو ملامت کرنے اور ان کا مذاق اڑانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اگر کوئی شخص مکمل تحقیق کے ساتھ اور کسی حب اور بغض کے بغیر ان دس سالوں کی تاریخ کا مطالعہ کرے تو بعض مواقع پر وہ یوں محسوس کرتا ہے کہ شاید وہ اسلام سے پہلے کی قبائلی تاریخ کا ایک باب پڑھ رہا ہے اور بعض مواقع پر یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ مشرقی رومی سلطنت EASTERN ROMAN EMPIRE کی تاریخ کا کوئی باب پڑھ رہا ہے اس تاریخ میں اسے اسلامی حکومت کی بہت تھوڑی علامتیں نظر آئیں گی۔ اس موقع پر وہ محقق سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ کیونکر ممکن ہے کہ معاشرے میں کچھ ایسے لوگ بچ گئے ہوں جنہیں اس ماحول کے رنگ نے آلودہ نہ کر دیا ہو اور جو خود بھی اسلام کے حقیقی معنی سمجھتے ہوں اور یہ بھی چاہتے ہوں کہ اسلامی حکومت کو اس کی صحیح صورت میں زندہ اور برقرار کر دیں۔ لہذا یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم معاویہ کے دور حکومت کے آخری حصے اور یزید کی حکومت کے ابتدائی وقت میں بڑے بڑے اسلامی شہروں اور ان کے باشندوں کے حالات کا مطالعہ کریں۔

واقعۂ کربلا پر اسلامی شہروں کا ردِ عمل

فَاِذَا مُحِّصُوْا بِالْبَلَاءِ قَلَّ الدَّیَّانُوْنَ

جب ان کی آزمائش کی جائے گی تو دیندار تھوڑے ہوں گے۔

(حسینؑ بن علیؑ)

ایک اور موضوع اور شاید وہ آخری موضوع کہ جس کے بارے میں بحث ضروری معلوم ہوتی ہے اور جس کی جانب کتاب کے مقدمے میں بھی اشارہ کیا گیا ہے، یہ ہے کہ کوفے کو اور کسی حد تک بصرے کو چھوڑ کر بڑے بڑے اسلامی شہر کربلا میں ہونے والے اتنے بڑے حادثے پر کیوں خاموش بیٹھے رہے۔ جبکہ ان میں سے ہر ایک شہر میں ابھی رسول اکرمؐ کے کچھ صحابی موجود تھے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر لوگوں کو امام حسینؑ کی مدد کرنے کو کیوں نہ کہا؟ یا اگر وہ انکے قیام کی تائید نہیں کرتے تھے تو انہوں نے ان شہروں کے حاکموں سے یہ کیوں نہ کہا کہ وہ کوئی ایسی تدبیر سوچیں کہ نوبت ایسی دردناک خونریزی تک نہ پہنچے۔ اس خاموشی کے راز کو سمجھنے کے لیے ان میں سے ہر شہر کی اجتماعی حالت کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ نیز دمشق کی حکومت اور امام حسینؑ کے قیام کے بارے میں انکی حالت کو جانچنا چاہیے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ان شہروں کے لوگ کس حد تک اس قیام سے دلچسپی رکھتے

تھے یا اس سے الگ رہنا چاہتے تھے۔ اس باب میں ہم ان شہروں میں سے ہر ایک کی صورتِ حال کا مختصر جائزہ لیں گے۔

دمشق: اس صوبے کے لوگ جس دن سے مسلمان ہوئے تھے انہوں نے اپنے آپ کو خالد بن ولید، معاویہ بن ابوسفیان اور ضحاک ابن قیس کے زیرِ تسلط دیکھا تھا۔ ان میں سے بیشتر نے دیندار مسلمانوں کا جو نمونہ دیکھا وہ یہی لوگ تھے اور وہ قرآن مجید کے احکام کو انہی والیوں، حاکموں اور ان کے مصاحبوں کے کردار کی روشنی میں جانتے پہچانتے تھے۔ معاویہ نے اپنے بیٹے کو شامیوں کے بارے میں کہا تھا: "شام کے لوگوں کو اپنے آگے آگے رکھو، اگر تمہیں کسی دشمن کا خوف ہو تو انہیں دشمن کے خلاف جنگ لڑنے کے لیے بھیج دو لیکن جو کام ان کے سپرد کیا جائے، جب وہ اسے انجام دے چکیں تو انہیں شام سے باہر مت رہنے دو۔ انہیں فوراً واپس ان کے گھروں میں بھیج دو تاکہ وہ بیگانوں کی عادتیں نہ اختیار کر لیں۔" [1]

اسی مختصر قول سے جو اس سرزمین کے لوگوں کی ذہنیت اور معاویہ کی دور اندیشی کا آئینہ دار ہے، اس سے امویوں کی حمایت میں ان لوگوں کی ثابت قدمی کے معیار کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مندرجہ ذیل داستان پر نظر ڈالیے کہ جو تاریخی حقیقت کی بجائے لطیفے سے زیادہ ملتی جلتی ہے۔ اگر اصل داستان وضعی بھی ہو تو بھی یہ یقینی طور پر درست ہے کہ شام کے لوگ اسلامی نظامِ حکومت، احکامِ دین اور رسولِ اکرمؐ کے خاندان کے بارے میں کس قدر بے علم تھے۔

---

[1] عقد الفرید۔ جلد ۵ صفحہ ۱۱۵

"عبداللہ بن علی نے شام کے کچھ مشائخ سفاح کے پاس بھیجے اور اسے کہلا بھیجا کہ یہ اس ملک کے عقلمند لوگ ہیں۔ یہ سبھی قسم کھاتے ہیں کہ جب تک آپ امیر نہیں بن گئے ہمیں کوئی علم نہ تھا کہ بنی امیہ کے علاوہ رسول اکرمؐ کے کوئی ایسے رشتہ دار بھی ہیں جو ان سے ورثہ پا سکیں"۔[1]

۱۸ھ سے جب عمر بن خطاب نے دمشق کی حکومت معاویہ کے سپرد کی، ۶۰ھ تک ۴۲ سال ہوتے ہیں۔ اس دوران میں جو لوگ مدینہ سے دمشق گئے، جب ہم ان کے ناموں کی فہرست پر نظر ڈالتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ وہ بالعموم قریش اور مضری ہیں۔ ان لوگوں نے جو خود رئیسانہ زندگی کے خوگر ہو گئے تھے، جب روم کی رہی سہی شان وشوکت دیکھی تو اس سے مرعوب ہونے کے ساتھ ساتھ اس پر فریفتہ بھی ہو گئے۔ اس ٹھاٹھ باٹھ کی طرف مائل ہونے پر جب خلیفہ عمر نے باز پرس کی تو جواب میں معاویہ نے جو کچھ کہا، اس سے پتا چلتا ہے کہ ابتدا میں ہی وہ خلیفہ اور اصحاب رسولؐ کے طور طریقوں سے منحرف اور شام کی شاہنشاہانہ حکومت کے طرز عمل پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ جب ایک علاقے کا حاکم اور امیر اپنے لیے یوں دربار سجائے تو قدرتی طور پر اس کے ماتحت بھی اس کی تقلید کریں گے۔

۳۵ھ سے جب عثمان کو مدینہ میں قتل کر دیا گیا اور امام علیؑ خلیفہ بنے، معاویہ نے بتدریج لوگوں کو یہ بات باور کرا دی کہ مسلمانوں کے خلیفہ کے قتل میں امام علیؑ کا ہاتھ تھا۔ پھر جب ایک اور مسلمان (معاویہ) اس کے قتل کا انتقام لینے اور شرعی حد جاری کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور اس

---

[1] الهفوات النادرہ صفحہ ۳۷۱

نے ان (امام علیؑ) سے قاتلانِ عثمان کی حوالگی کا مطالبہ کیا تو وہ ایسا کرنے پر آمادہ نہ ہوئے، یوں امام علیؑ سے شامیوں کی دشمنی نے دینی رنگ اختیار کر لیا۔

جب ہم شام کی کیفیت کا مقابلہ عراق اور حجاز سے کرتے ہیں اور معاویہ اور ان کے بیٹے یزید کے لیے شامیوں کی غیر مشروط حمایت کو دیکھتے ہیں تو ایک بار پھر ابن کواء کا قول صحیح معلوم ہوتا ہے، جس نے کہا تھا کہ "دوسروں کے مقابلے میں شام کے لوگ اپنے امام کے زیادہ فرمانبردار ہیں"۔ اسی فرمانبرداری اور بلاچون و چرا اطاعت کی خاطر امام علیؑ اپنے لوگوں سے دکھی رہتے اور فرماتے تھے: "میں اس بات پر تیار ہوں کہ تم میں سے دس آدمی دیدوں اور اس کے بدلے میں معاویہ کے حمایتیوں میں سے ایک آدمی لے لوں[1]"۔

مکہ: یہ شہر زمانۂ جاہلیت میں اور پھر اسلامی دور میں بھی ایک ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ یہ مسلمانوں کا قبلہ، حاجیوں کی زیارتگاہ اور خدائے تعالیٰ کا دار الامان تھا۔ وہاں رسول اکرمؐ کے رشتہ داروں کا ایک گروہ زندگی بسر کر رہا تھا لیکن ان لوگوں نے ۶۱ھ کے حادثہ کربلا سے اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھا اور ان کی کیفیت تقریباً اس خونیں منظر کے تماشائیوں کی ہو گئی۔ علاوہ بریں شہر کے ممتاز لوگوں میں سے نہ تو کوئی امام حسینؑ کے ساتھ عراق گیا اور نہ ہی کسی نے انہیں سنجیدگی سے کہا کہ وہ مکہ میں رہ جائیں۔ حالانکہ اگر ان سے کوئی ایسا تقاضا کیا بھی جاتا تو وہ قبول نہ کرتے۔ کیونکہ جب ابن زبیر نے ظاہرداری کے طور پر امام حسینؑ سے

---

[1] نہج البلاغہ جلد ۲ صفحہ ۱۰

یہ درخواست کی تھی کہ آپ مکہ ہی میں قیام پذیر رہیں تو آپ اس کے لیے آمادہ نہیں ہوئے۔ تاہم امام حسینؑ کی تحریک سے مکہ کے لوگوں کے الگ تھلگ رہنے کی کئی ایک وجوہات تھیں۔ پہلی وجہ یہ کہ ابن زبیر نے طویل عرصے سے مکہ کو اپنا ہیڈکوارٹر بنا رکھا تھا اور مکہ و حجاز کے بہت سے لوگ اس کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ معاویہ نے اپنے آخری سالوں میں اور بالخصوص اس وقت سے جب اس نے یزید کو اپنا جانشین مقرر کرنے کا فیصلہ کیا تھا، مہاجرین، انصار اور دیگر صحابہ کی اولاد کی دلجوئی اور احترام میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ چنانچہ معاویہ کے بعد اگرچہ اس شہر کے لوگ یزید اور شام کی حکومت کی جانب کوئی خاص میلان نہیں رکھتے تھے، تاہم دوسرے مصلحت پرستوں کی طرح وہ بھی اس انتظار میں تھے کہ دیکھیں انجام کیا ہوتا ہے؟ کیونکہ تاریخ بتاتی ہے کہ جب امام حسینؑ مکہ سے عازمِ عراق ہوئے اس وقت بجز دو تین اشخاص کے جنہوں نے بزعمِ خود خیر خواہی کے طور پر انہیں وہاں جانے سے باز رکھنا چاہا اور ان لوگوں کے سوا جو حاکم مکہ نے سفرِ عراق کے دوران آپ کی نگرانی کے لیے بھیجے تھے، کسی نے موافقت یا مخالفت میں ایک لفظ نہیں کہا۔ حالانکہ ضروری تھا کہ اس شہر میں بھی عراق کے شہروں کی طرح انجمنیں تشکیل دی جاتیں اور وہ لوگ امام حسینؑ کے پاس جاتے اور ان سے کہتے کہ آپ مکہ ہی میں رہیں اور اپنی خلافت کا اعلان کر دیں یا وہ لوگ ان کے ساتھ عراق جاتے اور ان کے پہلو میں کھڑے ہوتے۔

جب عبداللہ ابن زبیر کو معلوم ہوا کہ امام حسینؑ نے عراق جانے کا قطعی فیصلہ کر لیا ہے تو اس نے بھی اطمینان کا سانس لیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ

ابن زبیر اور اس کے ساتھی امام حسینؑ کے مکہ میں رہنے سے چنداں خوش نہ تھے۔ اس کا ثبوت ان اشعار سے ملتا ہے جو عبداللہ ابن عباس نے اس موقع پر ابن زبیر سے مخاطب ہو کر کہے تھے:

اب جبکہ میدان تیرے لیے خالی ہو گیا ہے اور کوئی جھگڑا باقی نہیں تو سکونِ قلب سے جو تیرے جی میں آئے کر۔[1]

مدینہ: ابن کواء اس شہر کے لوگوں کو معاویہ سے یوں متعارف کراتا ہے:

یہ لوگ شر پیدا کرنے میں امت کے حریص ترین لوگ ہیں اور اسے دور کرنے میں سب سے زیادہ کمزور ہیں۔[2]

اگرچہ یہ رائے حسد اور کینہ بلکہ ایمان کی کمزوری سے خالی نہیں ہے لیکن پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ اس آدھی صدی میں مدینہ والوں میں بھی زبردست تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ مدینہ وہ پہلا شہر ہے کہ جس کے باشندوں نے سچے دل سے رسول اکرمؐ کی دعوت قبول کی تھی۔ یہ شہر ۳۵ سال تک مسلمانوں کے معاملات کے حل و فصل کا مرکز رہا تھا۔ اسلام کے بہت سے بزرگوں نے یہیں زندگی گزاری تھی اور یہیں فوت ہوتے تھے۔ انصار نے جو یمانی عرب تھے آنحضرتؐ کو مکہ سے مدینہ بلایا اور ان کی مدد کی حتیٰ کہ انہوں نے قریش پر فتح پائی اور مکہ فتح کر لیا۔

جیسا کہ ہم پہلے پڑھ چکے ہیں، قریش تجارت پیشہ اور مالدار لوگ تھے

---

[1] طبری جلد ۷ صفحہ ۲۷۵ [2] تاریخ تمدن اسلامی جلد ۴ صفحہ ۶۴۔ طبری جلد ۶ صفحہ ۲۹۲۶

اور چونکہ وہ اپنے قبیلے اور عام مضریوں کو دوسرے عربوں سے برتر سمجھتے تھے، اس لیے انصار مدینہ کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ جب سقیفہ بنی ساعدہ میں اجتماع ہوا، اس میں انصار کا رئیس اپنے لوگوں کو قریش کا ہم پلہ قرار دینا چاہتا تھا، اس لیے اس نے کہا: "ایک امیر ہم میں سے ہونا چاہیئے اور ایک امیر تم میں سے ہونا چاہیئے لیکن ابوبکر بن قحافہ نے اس کی بات نہیں مانی اور کہا کہ حکومت پر قریش کا حق ہے۔ عمر بن خطاب اور عثمان بن عفان کی حکومت میں قریش اور مضریوں نے رفتہ رفتہ شہر کا اختیار سنبھال لیا اور اشراف کا ایک طبقہ وجود میں آگیا اور جب اس طبقے کے پاس دولت کی بھرمار ہو گئی تو وہ آرام وہ اور خوشحال زندگی کے عادی ہو گئے۔ جب طلحہ اور زبیر امام وقت سے جدا ہو کر عراق روانہ ہو گئے اور امام علیؑ بن ابی طالبؑ ان کے تعاقب میں گئے، عبداللہ بن سلام انہیں راستے میں ملے تو ان سے کہا: آپ مدینے سے نہ جائیں۔ اگر ایک بار آپ یہاں سے باہر چلے گئے تو پھر کبھی لوٹ کر یہاں نہیں آئیں گے۔"

جب امام علیؑ ربذہ گئے تاکہ وہاں سے بصرہ جائیں تو آپ کے ساتھ فقط تین سو آدمی تھے[1] ان میں بھی بیشتر وہ اشخاص تھے جو قتل عثمان کے وقت باہر سے آکر مدینہ میں جمع ہو گئے تھے۔ اگر خلافت کے مرکز کی حجاز سے عراق منتقلی ایک طرف سیاسی لحاظ سے مدینہ کی شکست قرار پائی تو دوسری طرف اس شہر والوں کو فکر سے نجات مل گئی۔ پھر جب امام حسینؑ مدینہ سے چلے تو بھی کوئی خاص ردعمل دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ

---

[1] طبری جلد ۶ صفحہ ۳۱۴۷

طرفدار بن گئے، جس طرح کوفہ کے لوگ امام علیؑ کے حمایتی تھے۔ جب امام علیؑ شہید ہوئے اور حکومت معاویہ کے ہاتھ آگئی تو اس نے ان دونوں شہروں کی باہمی عداوت کو حتی الوسع اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس نے بصرہ کے مضریوں اور یمانیوں کے ایک گروہ کو اپنے ساتھ ملالیا اور جیسا کہ ہم آئندہ ابواب میں بیان کریں گے، جب معاویہ کے مرنے کے بعد عراق کے لوگ یزید کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور حسینؑ ابن علیؑ کو دعوت دی، اس وقت جو خط امام حسینؑ نے اہل بصرہ کو لکھا، اس کے جواب میں فقط دو قبیلوں نے ان کی آواز پر لبیک کہی لیکن وقت آنے پر وہ آپ کی مدد کو نہ پہنچے۔

کوفہ: یہ شہر سعد بن ابی وقاص نے ۱۷ھ میں فوجیوں کے قیام کی خاطر آباد کیا اور کہا جاتا ہے کہ یہ ۱۷ھ یا ۱۸ھ میں تعمیر ہوا۔ بہر حال شروع میں اس کی تعمیر کا مقصد فوجیوں کو رہائش کے لیے جگہ مہیا کرنا تھا، لیکن زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ رسول اکرمؐ کے اصحاب اور دوسرے لوگ بھی وہاں منتقل ہو گئے۔ پھر جوں جوں مشرق کی جانب فتوحات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا، مفتوحہ علاقوں کے بہت سے لوگ بھی کوفہ آنے لگے۔ امام علیؑ جب طلحہ و زبیر کا تعاقب کرتے ہوئے عراق آئے تو کوفہ کے حاکم ابو موسیٰ اشعری نے امام وقت کی اطاعت میں ہوتے ہوئے بھی فتنہ سے دور رہنے کے بہانے وہاں کے لوگوں کو فوج میں شامل ہونے سے باز رکھا لیکن آخر کار اسے حکومت سے دستبردار ہونے پر مجبور کر دیا گیا اور کوفہ کے لوگوں نے امام علیؑ کا ساتھ دیا، حتیٰ کہ انہوں نے بصرہ کے لشکر پر فتح پائی۔

جنگ بصرہ کے بعد امام علیؑ نے کوفہ کو اپنی حکومت کا مرکز قرار دیا اوراس وقت سے اس شہر کو اسلامی شہروں میں خاص اہمیت حاصل ہو گئی۔ ہم جس زمانے کا جائزہ لے رہے ہیں۔ اس وقت اس شہر میں قسم قسم کے لوگ آباد تھے اوران میں سے ہر گروہ کے مقاصد، معتقدات اور جذبات دوسرے گروہوں سے مختلف تھے۔ عربوں میں سے یہاں یمانیوں کی قابل لحاظ اکثریت تھی۔ گزشتہ ابواب میں ہم یمانیوں اور مضریوں کی رقابت بلکہ دشمنی کا مختصر ذکر کر چکے ہیں، یہاں اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ادھر مفتوحہ علاقوں کے وہ لوگ جنہوں نے کوئی ہنر یا علم سیکھ رکھا تھا وہ رتبہ اور مقام حاصل کرنے یا اپنے پیشے اور ہنر کو کام میں لانے اور اس سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے رفتہ رفتہ کوفہ میں آنے لگے۔ چونکہ ان لوگوں میں سے ہر گروہ اسلامی فتح سے پہلے مختلف عقیدوں اور فلسفوں کی جانب راغب تھا، لہٰذا ان کے کوفہ میں یکجا ہونے سے بحث و مباحثہ کا بازار گرم ہو گیا۔

بعض روایات جن کے بارے میں ہمیں یہ معلوم نہیں کہ وہ کس حد تک صحیح ہیں، ان سے پتا چلتا ہے کہ ۳۵ تا ۴۰ھ کے دوران کوفہ میں مسئلہ قضاء و قدر کے بارے میں بحث و مباحثہ بڑے زوروں پر تھا۔ ایک بار خود امام علیؑ بھی کچھ ایسے لوگوں کے پاس سے گزرے جو اس بحث میں مصروف تھے اوران میں سے ہر ایک بہ آواز بلند اپنے نظریے پر زور دے رہا تھا۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں، قضا و قدر کی بحث علم کلام کا پہلا موضوع یا مسلمانوں میں ہونے والی قدیم ترین بحثوں میں سے ہے۔ اس میں بحث کا موضوع یہ ہوتا تھا کہ کیا لوگ اپنے افعال میں

خود مختار ہیں یا مجبور ہیں؟

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ ان بحثوں کے رواج سے مسلمانوں میں کتنے ہی اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ جو لوگ وادیٔ فرات کے دوسرے مقامات سے اس شہر میں آئے، وہ بھی اپنی ذہنیت اور اخلاق کے لحاظ سے سرزمین حجاز کے باشندوں جیسے نہ تھے۔ شدید احساسات کا شکار ہونا، وقتی طور پر جوش میں آنا، نتائج پر نظر نہ رکھنا، جلد بازی میں فیصلے کرنا اور پھر جلد ہی پشیمان ہونا ان لوگوں کی خصوصیات تھیں۔ تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ جو چیز ان لوگوں کے کام کی نہ تھی اور جسے ان کے کان قبول نہیں کرتے تھے، وہ واقع بینی اور خیر خواہی پر مبنی بات ہوتی تھی۔ اس کے برعکس جس چیز کو وہ دل و جان سے چاہتے اور کان لگا کر سنتے تھے، وہ ایسی بات ہوتی جو جذبات اور احساسات کو برانگیختہ کرتی ہے اور کہنے والا اسے زیادہ جوش اور ولولے کے ساتھ کہتا ہے۔ مگر ان سننے والوں کے لیے اس چیز کی کوئی اہمیت نہ تھی کہ کہنے والا گلا پھاڑ کر جو کچھ کہہ رہا ہے اس میں اس کی اصل غرض کیا ہے۔ عثمان بن عفان کی خلافت کے خاتمے سے لے کر اس وقت تک کہ جب خلافت کا مرکز بغداد منتقل ہو گیا اور ایک نیا قبیلہ مسلمانوں کی عام سیاست پر حاوی ہو گیا۔ کوفہ کے لوگ آرام سے نہیں بیٹھے۔ جب کوئی ظالم یا قابل حاکم ان پر مسلط ہو جاتا تو وہ اپنے گھروں میں دبک جاتے اور خاموش بیٹھے رہتے اور جب انہیں معلوم ہو جاتا کہ حکومت کمزور ہے تو وہ گروہ بندی اور سازشوں میں مصروف ہو جاتے، بغاوت پر اتر آتے اور ہنگامہ برپا کر دیتے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک شاعر نے اپنے شہر کے بعض لوگوں کے بارے میں جو کچھ کہا

ہے وہ اہل کوفہ کی اس جماعت پر صادق آتا ہے۔

یعنی وہ ظالم اور بدخواہ کے سامنے عاجز اور مسکین ہیں اور

عاجز اور مسکین کے سامنے ظالم اور بدخواہ ہیں۔

جب معاویہ نے ابن کواء سے پوچھا کہ اسلامی شہروں کے لوگوں کے اخلاق اور ان کی صفات کیسی ہیں؟ تب اس نے کوفہ کے لوگوں کے بارے میں کہا:

"وہ کسی کام کے متعلق آپس میں متفق ہو جاتے ہیں اور پھر ٹولیوں کی شکل میں اس سے لاتعلق ہو جاتے ہیں!" [1]

۶۶ھ سے ۷۵ھ تک جبکہ عبدالملک بن مروان نے حجاج بن یوسف کو اس شہر کا والی بنایا اور اس نے اپنی سخت بلکہ وحشت ناک سیاست سے لوگوں کا سانس لینا دشوار کر دیا۔ اس مدت کے علاوہ بہت کم ایسے سال نظر آتے ہیں جب کوفہ شورشوں، ہنگاموں اور گروہ بندیوں سے باز رہا ہو۔ ان لوگوں کی اسی متلون مزاجی کے پیش نظر ہی معاویہ نے یزید کو نصیحت کی تھی کہ اگر عراقی تجھ سے ہر روز ایک عامل کو معزول کرنے کے لیے کہیں تو ان کا کہا مان لینا، کیونکہ ایک حاکم کو ہٹانا ایک لاکھ تلواروں کا سامنا کرنے سے زیادہ آسان ہے۔ [2]

یوں معلوم ہوتا ہے کہ معاویہ ان لوگوں کا انجام بالکل واضح طور پر دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ جب اس نے یزید کو امام حسینؑ کے بارے میں وصیت کی تو کہا: "جنہوں نے حسینؑ کے باپ کو قتل کیا اور اس کے بھائی کو

---

[1] تاریخ تمدن اسلامی جلد ۴ صفحہ ۶۴ [2] عقد الفرید جلد ۵ صفحہ ۱۱۵

بے بس کیا، مجھے امید ہے کہ وہ اسے تجھ کو نقصان پہنچانے سے باز رکھیں گے۔[1]

یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر کوفہ کے بیشتر لوگوں نے جنگ بصرہ میں امام علیؑ کی مدد کی اور بعد میں جنگ صفین میں بھی ان کا ساتھ دیا تو اس کی وجہ ان کی یہ خواہش تھی کہ اسلامی خلافت کا مرکز حجاز سے عراق منتقل ہو جائے تاکہ وہ یہ امتیاز حاصل کر کے شام پر کاری ضرب لگا سکیں۔ نیز شامیوں اور عراقیوں کی رقابت کوئی نئی چیز نہ تھی۔ ان دونوں علاقوں کے لوگوں کے اختلافات میں قبائلی جھگڑوں کے علاوہ سیاسی اور اقتصادی وجوہ بھی کارفرما تھیں۔ عراق بحر ہند کی تجارت میں درمیانی واسطے کا کام دیتا تھا۔ جبکہ بحیرہ روم پر شام کا کنٹرول تھا اور عراق ان دو تجارتی شاہراہوں کو ایک کڑی کی مانند باہم جوڑتا تھا، دوسری طرف حیرہ کے بادشاہ کسرائے ایران کے طفیلی اور شام کے غسانی حکمران قیصر روم کے ماتحت تھے۔ ان دو عظیم سلطنتوں کی رقابت نے بھی ان دو علاقوں کے لوگوں کے درمیان دشمنی کی آگ بھڑکانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

ان کی یہ رقابت اسلام کے بعد بھی بدستور قائم رہی اور بالخصوص جب کوفہ مرکز خلافت بن گیا تو عراقیوں کو اپنی دیرینہ آرزو پوری ہوتی نظر آئی۔ تاہم ایک نکتے کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے اور وہ یہ کہ شام کے لوگ اپنے حاکم کی اطاعت میں بہت ہی مخلص اور ثابت قدم تھے جبکہ عراق کے لوگ حکومت کے کاموں میں بے جا دخل دے کر اور اپنے وقتی فیصلوں کو

---

[1] عقد الفرید جلد ۵ صفحہ ۱۱۵

منسوخ کر کے اپنے خلیفہ کے لیے مشکلات پیدا کر دیتے تھے۔ وہی لوگ جنہوں نے مہینوں امام علیؑ کا ساتھ دیا اور فتح کے قریب پہنچ گئے، آخر وقت اپنے امام کی بات سننے کے بجائے عمرو ابن عاص کی چال میں آگئے۔ چنانچہ جب اس نے قرآن نیزے پر بلند کیا اور انہیں اس کا فیصلہ قبول کرنے کو کہا تو ان لوگوں نے امام علیؑ کو مجبور کیا کہ وہ شامیوں کی یہ بات مان لیں۔ تب امام علیؑ نے انہیں ہر چند سمجھایا کہ پسر نابغہ (عمرو بن عاص) اور ابوسفیان کے بیٹے (معاویہ) نے قرآن کو جنگ سے فرار کا ایک بہانہ بنایا ہے لیکن انہوں نے سنی ان سنی کر دی۔ پھر جب ان کے اصرار پر ثالثی کا فیصلہ ہوا اور شام کے ثالث نے عراق کے ثالث کو دھوکا دیا تو کوفیوں نے اس شکست کو اپنے لیے ایک بہت بڑی شرمناک چیز سمجھا۔ انہوں نے فوراً ہی امام علیؑ سے کہا کہ وہ معاویہ سے از سر نو جنگ شروع کر دیں، جبکہ آپ نے اس سے ایک سال کے لیے جنگ بندی کا پیمان باندھا تھا اور آپ اس کو توڑنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ بات ان لوگوں کے ایک بڑے گروہ پر بہت گراں گزری اور نتیجے کے طور پر وہ گروہ امام علیؑ سے الگ ہو گیا جو خوارج کے نام سے مشہور ہوا۔ امام علیؑ اہل کوفہ کے یہ الٹ پھیر، ہٹ دھرمی اور ناعاقبت اندیشی دیکھتے تو فرماتے تھے:

"شامی اپنے جھوٹ میں متفق الرائے ہیں اور تم اپنی سچائی میں بکھرے ہوتے ہو۔ میں اس بات پر تیار ہوں کہ تم میں سے دس افراد دیکر معاویہ کے حمایتیوں میں سے ایک آدمی لے لوں۔"

جب معاویہ نے امام حسنؑ سے صلح کا پیمان باندھا اور وہ حجاز چلے گئے تو اسے عراق میں کسی منظم فوج سے جنگ کی فکر باقی نہ رہی اور

پھر جہاں تک ہو سکا اس نے عراقیوں کو تکالیف پہنچانے سے دریغ نہیں کیا۔ اس نے بہت سے متقی اور دیندار لوگوں کو امان نامے دیکر مکر و فریب سے اپنے جال میں پھانسا اور بعد میں اسلامی قانون کے برخلاف ان کے قتل کا حکم دیدیا۔ نیز اس نے شامیوں کے سامنے عراق کے سربرآوردہ اشخاص کو ذلیل کرنے میں بھی کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اور اہل عراق یہ ظلم و ستم اور تذلیل سہتے سہتے تنگ آ گئے تھے۔ چنانچہ جونہی معاویہ کی موت واقع ہوئی، کوفہ والوں نے یہ سمجھا کہ انہیں ایک سخت اقدام کرنے کے لیے ایک مناسب موقعہ ہاتھ آ گیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پاک دل مسلمانوں کا ایک گروہ جو اتنا چھوٹا بھی نہ تھا وہ بھی اس شہر میں موجود تھا۔ جابر حاکموں کے ہاتھوں پیغمبر اکرم ؐ کی سنت تبدیل کیے جانے کی بنا پر ان لوگوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ وہ دل ہی دل میں کڑھتے رہتے اور چاہتے تھے کہ ایک عادل امام اٹھے اور کئی سال سے جو بدعتیں پیدا ہو گئی ہیں ان کا خاتمہ کر دے۔ تاہم اگر ایک بڑی اکثریت اس قسم کا دعویٰ کرتی بھی تھی تو یہ جنگ صفین میں شکست سمیت سابقہ شکستوں کے انتقام اور مضریوں سے یمانیوں کے بدلہ لینے کے لیے ایک آڑ تھی۔ کوئی کیا کہہ سکتا ہے کہ ان میں کئی اشخاص ایسے بھی ہوں جنہوں نے بچپن میں اپنی ماؤں کی گودمیں لخمیوں اور غسانیوں کے قصے سنے ہوں اور ان کے ارادے کے بغیر ایک خفیف سے خیال نے انہیں اپنے دور دراز ماضی کے نزدیک کر دیا ہو۔

ان یادوں نے اس گرد کو جو وقت نے عراقیوں اور شامیوں کی دشمنی پر ڈال دی تھی الگ کر دیا اور کوفہ بغاوت پر آمادہ ہو گیا۔ جب ہم ان

تین اسلامی صوبوں اور پانچ اہم شہروں کے حالات کا مختصر مطالعہ کرتے ہیں کہ جنہوں نے مسلمانوں کی قسمت متعین کرنے میں اپنا کردار ادا کیا تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ معاویہ کے بعد وہ واحد صوبہ کوفہ ہی تھا جو دمشق کی حکومت کا سقوط چاہتا تھا۔ وہاں کے لوگوں نے اس مقصد کے لیے عملی اقدامات بھی کیے تھے لیکن جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، جن لوگوں نے امام حسینؑ کو خط لکھ کر انہیں عراق بلایا اور مدد کا وعدہ کیا وہ سب کے سب اپنے دلوں میں دین کا درد نہیں رکھتے تھے۔ یہ دعوت بظاہر دینی تھی لیکن اس کے پیچھے ان کی بہت سی سیاسی اغراض بھی پوشیدہ تھیں۔ یعنی عراق شام پر کاری ضرب لگانا چاہتا تھا اور اگر ممکن ہوتا تو خلافت کا مرکز دمشق سے کوفہ منتقل کرنا چاہتا تھا۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں، ۳۵ھ میں عراق اور مصر کے انصاف طلب لوگوں کے بہت سے گروہ خلیفہ عثمان سے احتجاج کرنے کے لیے مدینہ پہنچے اور اس طرح اسلام میں پہلا فتنہ برپا ہوا۔ تاہم ۶۰ھ میں عراق کے علاوہ کہیں بھی کوئی جوش و خروش دیکھنے میں نہیں آیا، کیوں؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس صدی کی دوسری چوتھائی میں اسلامی معاشرہ تباہی کے گہرے غار میں جا گرا تھا۔ آخر کار اہل کوفہ نے حکومت شام کے خلاف بغاوت کر دی۔ لیکن جیسا کہ ہم دیکھیں گے اس کے لیے حالات کا صحیح اندازہ نہیں لگایا گیا۔ بلکہ ان کی یہ بغاوت تند و تیز جذبات کی پیداوار اور شعلہ بار تقریروں کا نتیجہ تھی۔ یہ ایک ایسی بغاوت تھی جس میں مخالف فریق کی طاقت، اس کے عاملوں کی مہارت اور سب سے بڑھ کر بغاوت کرنے والوں کی ثابت قدمی یا کمزوری پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔

سنّت کی جگہ بدعت کا چلن

لَقَدْ کَانَ فِیْ قَصَصِہِمْ عِبْرَۃٌ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ

بلاشبہ ان کے قصوں میں عقلمندوں کے لیے عبرت ہے۔

(یوسفؑ۔ آیت ۱۱۱)

اس سے پیشتر کہ ہم معاویہ کی موت کے بعد پیش آنے والے واقعات کا جائزہ لیں، یہ دیکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ ہم گزشتہ ابواب میں پڑھ چکے ہیں اس کا خلاصہ کیا ہے۔ چنانچہ چند ابواب میں جو کچھ کہا گیا ہے، اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں:

۱۔۔۔ ان دنوں مسلمانوں کی جو نسل جزیرہ نمائے عرب میں تھی وہ ساری کی ساری تقریباً عمر بن خطاب کی خلافت میں پیدا ہوئی، عثمان بن عفان کے زمانے میں پروان چڑھی اور امیر معاویہ کے ابتدائی عہد میں معاشرے میں شامل ہوئی تھی۔

۲ــــ اس نسل کے جن لوگوں کی عمر پچاس سال تھی، انہوں نے رسول اکرمؐ کو نہیں دیکھا تھا اور جو لوگ ساٹھ سال کے پیٹے میں تھے ان کی عمر آنحضرتؐ کی رحلت کے وقت دس سال تھی۔ جن لوگوں نے آنحضرتؐ کی زیارت کی اور ان کی صحبت میں رہے تھے، ان میں سے فقط چند افراد ہی باقی تھے جو کوفہ، مدینہ، مکہ یا دمشق میں تھے۔ یہ ستر سال یا اس سے کچھ زیادہ عمر کے لوگ تھے جو زندگی کے کاروبار میں دلچسپی لینے کی بجائے سفر آخرت کی تیاری کرنے اور موت کو گلے لگانے کو ترجیح دیتے تھے۔

۳ــــ لوگوں کی اکثریت اور بالخصوص جوان طبقہ جو معاشرے کی سرگرمیوں کے پہیے کو حرکت میں لاتا ہے۔ یعنی جن اشخاص کی عمریں ۲۵ اور ۳۵ سال کے درمیان تھیں وہ اسلامی نظام کو جس شکل میں دیکھتے اور اس میں زندگی بسر کرتے تھے، وہ ایک ایسی حکومت تھی جس کا نظم و نسق مغیرہ ابن شعبہ، سعید ابن عاص، ولید، عمرو ابن سعید اور قریش کے چند ایک دوسرے رئیس زادے چلاتے تھے۔ یہ لوگ فاسق، ظالم، غاصب اور شان و شوکت کے شیدائی اور ان سب سے بدتر یہ کہ قبیلہ پرست تھے۔ اس نسل نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، اپنے آپ پر ایسے بے رحم حاکموں کو مسلط پایا جو اپنے ہر مخالف کو یا تو مار ڈالتے تھے یا قید میں ڈال دیتے تھے۔ غلط کاموں پر اعتراض کرنے والوں کو گرفتار کرنا، جلاوطن کرنا، قید خانے میں ڈال دینا یا قتل کر دینا ان کے لیے معمولی بات تھی اور مملکت میں رائج نظام بھی ان مظالم کی توثیق کرتا تھا۔

۴۔ مسلمانوں کے جس گروہ نے عمر بن خطاب کے زمانے کی سخت گیری دیکھی تھی اور اس کی طرف سے باز پرس کے خوف سے ظاہر داری برتنے پر مجبور تھے لیکن جب بعد میں انہیں دولت نصیب ہوئی تو انہوں نے اپنے لیے آرام و آرائش کے سامان مہیا کر لیے تاکہ بڑھاپے اور ناتوانی کے زمانے میں ان سے بہرہ مند ہو سکیں۔ چونکہ اب وہ اپنی آسائش میں خلل نہیں ڈالنا چاہتے تھے، اس لیے جو حادثہ بھی پیش آتا اور خواہ وہ ظاہر دین کے کتنا ہی برخلاف کیوں نہ ہو، وہ اس سے الگ رہنے کے لیے کوئی نہ کوئی تاویل گھڑ لیتے تھے تاکہ اپنے ضمیر کی سرزنش سے محفوظ رہیں۔ تب وہ اپنے آپ سے کہتے تھے: "مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ رہنا اور کوئی تفرقہ نہیں ڈالنا چاہیے۔" نیز یہ حاکم جو مرکز اسلام کی حفاظت کا ذمہ دار ہے، اس سے الجھنا نہیں چاہیے۔

۵۔ جب اس سرزمین کے لوگ اپنے ہمسایہ ملکوں کے طرز فکر سے آگاہ ہوتے اور فلسفیانہ بحثیں مسجدوں میں آ پہنچیں تو اس گروہ کے لیے دینی ذمہ داریوں سے گریز کا راستہ کچھ زیادہ وسیع ہو گیا۔ پھر اموی حکومت کے دوسرے دور میں علم کلام کی پناہ گاہیں حاصل ہو جانے کے نتیجے میں "مرجئہ" نامی ایک گروہ وجود میں آیا جو اس حد تک آگے بڑھ گیا کہ اس نے کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے بھی مغفرت کی راہ ڈھونڈ نکالی۔

۶۔ جوں جوں مسلمان رسول اکرمؐ کے زمانے سے دور ہوتے وہ بیشتر اسلامی عادات و اطوار کو بھولتے چلے گئے اور رفتہ رفتہ ان میں

زمانۂ جاہلیت کے طور طریقے رواج پانے لگے۔ جن میں خاندانی برتری کا اظہار کرنا، اپنے رقیبوں کو ان کے ماضی کی یاد دلانا، نیز نسلی تعصب اور انتقامی جذبے کے تحت مختلف قبیلوں کا ایک دوسرے کے سامنے صف آرا ہو جانا وغیرہ شامل ہے۔

۷۔۔۔ تقویٰ اور عدالت جسے ہم اسلامی شریعت کی روح کہتے ہیں، وہ معاشرے میں ناپید تھی۔ جہاں تک دین کے اجتماعی احکام کا تعلق ہے ان میں سے فقط نماز جمعہ و جماعت کو رونق حاصل تھی اور وہ بھی محض رسم کے طور پر ادا کی جاتی تھیں۔ اس معاشرے میں بعض اوقات بدعت بلکہ فسق بھی یہی رسمی شکل اختیار کر لیتا تھا، جیسے خلیفہ عثمان کا مادری بھائی ولید جو کوفہ کا حاکم تھا، وہ ایک صبح مستی کی حالت میں مسجد پہنچا تو اس نے نماز فجر کی تین رکعتیں پڑھائیں اور پھر لوگوں سے کہنے لگا: اگر تم چاہو تو میں اس میں چند رکعتوں کا اضافہ بھی کر سکتا ہوں۔ [1]

ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اس واقعہ کو ایک بے بنیاد داستان ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، حتیٰ کہ وہ حطیئہ سے منسوب ان اشعار کو کسی اور کا کلام سمجھتا ہے اور اس کی دلیل یہ دیتا ہے: "اگر ولید نے نماز میں کچھ پڑھایا ہوتا تو کوفہ کے مسلمان جن میں رسول اکرمؐ کے اصحاب، قرار اور صلحاء شامل تھے وہ اس کی متابعت نہ کرتے ۔ ۔ ۔ ۔" [2]

---

[1] عقد الفرید جلد ۵ صفحہ ۵۵ [2] انقلاب بزرگ صفحہ ۱۰۰
اس سلسلے میں حطیئہ کے جو اشعار نقل کیے جاتے ہیں ان کا ترجمہ یہ ہے: جس

یہ دلیل بے حد کمزور ہے' اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ کوفہ کے قرّاء اور صلحاء نے بدعت کے ظہور کے آغاز سے ہی کنارہ کشی اختیار کر لی تھی اور دوسری یہ کہ خلیفہ عثمان نے اسی فعل کے بدلے میں ولید پہ حد جاری کی تھی بہرحال یہ واقعہ خلافت عثمان کے آخری دنوں کا ہے اور جب ہم اس میں مسلمانوں کی گراوٹ کی ایک چوتھائی صدی کا اضافہ کریں تو پتہ چل جائے گا کہ ۵۰ سال کے بعد مسلمانوں کے معاشرے کی حالت کیا ہو گئی۔

۸۔۔۔ رسول اکرمؐ اور ان کے بعد ابوبکر' عمر اور عثمان کے دور میں میدان جنگ کا فراور غیر عرب لوگوں کے علاقوں میں ہوا کرتا تھا۔ اس وقت عرب نہ صرف یہ کہ غیر عرب لوگوں بلکہ کافروں سے جنگ کرتے تھے لیکن جیسا کہ ہم گزشتہ ابواب میں لکھ چکے ہیں' جمل صفین اور نہروان میں مسلمان ایک دوسرے کے مقابلے پر آئے اور ایک دوسرے کو قتل کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ ایسے لوگ کہ جن کا ایمان کمزور تھا' ان کی نظر میں اس اسلامی جہاد نے "ایام عرب" کی جنگوں کا رنگ اختیار کر لیا اور دور جاہلیت کی خونخواہی پھر سے زندہ ہو گئی' جیسے حجۃ الوداع کے موقع پہ رسول اکرمؐ

دن حطیئہ اپنے پروردگار سے ملاقات کرے گا تو وہ گواہی دے گا کہ ولید عذر پیش کرنے کا حقدار ہے کیونکہ وہ لوگوں کی بھلائی چاہتا تھا اور اگر وہ قبول کرتے تو وہ شفع اور وتر کو اکٹھا کر دیتا۔ اے ولید! وہ تو کوفہ والوں نے تیری لگام کھینچ لی اور اگر وہ تجھے آزاد چھوڑ دیتے تو تو مسلسل بڑھتا ہی چلا جاتا۔

نے اپنے پاؤں تلے کچل دیا تھا۔

۹۔۔۔ اسلامی علاقوں میں سے شام مکمل طور پر بنی امیہ کا طرفدار تھا۔ مکہ اور مدینہ کے لوگوں نے امام حسینؑ کے قیام کے بارے میں کسی خاص ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ وہ فقط عراق اور عراق میں بھی کوفہ تھا جو اُٹھ کھڑا ہوا۔

۱۰۔۔۔ اگرچہ عراق کے لوگوں کا ایک گروہ دینی غیرت اور اسلامی حمیت کے تحت سنت محمدی کی تجدید اور عادلانہ حکومت کے قیام کا خواہشمند تھا، لیکن قبیلوں کے سردار اور اشراف کہ جن کے ہاتھوں میں تمام امور کی باگ ڈور تھی وہ مخلص اور نیک نیت نہیں تھے۔ جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے وہ چاہتے تھے کہ عراق فتح پائے اور وہ شام سے انتقام لے لیں، تاہم انہوں نے اس بات کا صحیح اندازہ نہیں لگایا تھا کہ شام ان کی اس جسارت اور جرأت کے جواب میں کیا ردعمل ظاہر کرے گا۔ پھر جونہی انہوں نے دیکھا کہ حکومت شام نے ابن زیاد کو بھیج کر عراق کے حالات پر توجہ کر لی ہے جھٹ سے انہوں نے بھی اپنا رخ تبدیل کر لیا اور یزید کی اطاعت کو فرزند رسولؐ کی فرمانبرداری پر مقدم سمجھا۔

یزید کی حکومت

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا

اور جب ہم کسی شہر کو تباہ کرنا چاہتے ہیں تو وہاں کے خوشحال لوگوں کو حکم دیتے ہیں (کہ حکومت کریں)۔

(اسراء۔ آیت ۱۶)

رجب ۶۰ھ میں دمشق کے مقام پر معاویہ کی موت واقع ہوگئی، اس وقت یزید حوارین میں رہتا تھا۔ جب وہ دمشق پہنچا تو لوگوں نے اس کے ہاتھ پر بیعت کرلی اور وہ مسلمانوں کا حاکم بن گیا۔ تب اس نے ولید بن عتبہ والیٔ مدینہ کو ایک خط بھیجا جس میں لکھا تھا:

"حسینؑ بن علیؑ، عبداللہ ابن عمر اور عبداللہ ابن زبیر کو اس وقت تک نہ چھوڑو جب تک ان سے میری خلافت پر بیعت نہ لے لو۔"

والیٔ مدینہ نے اس بارے میں مروان ابن حکم سے مشورہ کیا تو اس نے کہا: "اگر میری بات مانو تو اسی وقت جب کہ لوگوں کو معاویہ کی موت کا علم نہیں ہے، ابن زبیر اور حسینؑ ابن علیؑ کو بلوا بھیجو۔ اگر وہ بیعت کر لیں تو بہت خوب ورنہ ان کی گردنیں اڑا دو۔ کیونکہ اگر انہوں نے بیعت نہ کی اور لوگوں کو پتا چل گیا کہ معاویہ مر چکا ہے تو وہ ابن علیؑ اور ابن زبیر کے گرد جمع ہو جائیں گے اور فتنہ بڑھ جائے گا۔ جہاں تک ابن عمر کا تعلق ہے وہ کوئی سرگرم آدمی نہیں ہے، بجز اس کے کہ لوگ اس کے پاس جائیں اور خلافت اس کے سپرد کر دیں۔"

مروان کی یہ بات سن کر ولید نے انہیں بلوا بھیجا، عبداللہ ابن زبیر اور امام حسینؑ اس وقت مسجد میں تھے جب والی کا پیادہ پہنچا اور اس کا پیغام انہیں پہنچایا تو انہوں نے کہا: امیر کے پاس جاؤ اور اسے کہو کہ ہم ابھی آتے ہیں۔ جب وہ پیادہ چلا گیا تو ابن زبیر نے امام حسینؑ سے پوچھا: "ہمیں کیوں بلوایا گیا ہے؟"

امام حسینؑ نے جواب دیا: میرا خیال ہے کہ معاویہ مر چکا ہے اور ولید چاہتا ہے کہ اس سے پیشتر کہ لوگوں کو علم ہو وہ ہم سے یزید کی بیعت لے لے۔

عبداللہ نے کہا: میرا خیال بھی یہی ہے، اب آپ کیا کریں گے؟

امام حسینؑ نے فرمایا: میں حاکم کے پاس جاؤں گا لیکن اس لیے کہ مبادا وہ مجھے کوئی تکلیف پہنچائے، میں اپنے کچھ آدمی ہمراہ لے جاؤں گا اور انہیں ولید کے گھر کے دروازے پر کھڑا کر دوں گا تاکہ اگر نوبت لڑائی جھگڑے تک پہنچے تو وہ میری مدد کو پہنچیں۔

امام حسینؑ جب ولید کے پاس گئے اور اس نے انہیں معاویہ کے مرنے کی اطلاع دینے کے بعد ان سے یزید کے لیے بیعت طلب کی۔ تب امام حسینؑ نے فرمایا: میرے جیسا شخص خفیہ طور پر بیعت نہیں کرتا۔ تم دوسرے لوگوں کو بلاؤ اور مجھے بھی بلاؤ، پھر دیکھیں گے کہ کیا ہوتا ہے! ولید نے کہا: آپ بخوشی تشریف لے جائیں۔

اس پر مروان نے ولید سے کہا: ان کو مت جانے دو کیونکہ اگر یہ بیعت کیے بغیر چلے گئے تو پھر تم ان پر ہرگز قابو نہ پا سکو گے۔ مختصر یہ کہ اگر یہ بیعت نہ کریں تو ان کو قتل کر دو۔

یہ سن کر امام حسینؑ کو طیش آ گیا اور انہوں نے فرمایا: نہ تم مجھے قتل کر سکتے ہو اور نہ یہ حاکم مجھے قتل کر سکتا ہے۔ بالآخر امام حسینؑ اور ابن زبیر نے بیعت نہ کی اور مدینہ سے مکہ روانہ ہو گئے۔

جن دنوں دمشق کا حکمران حجاز کے بیعت نہ کرنے والوں پر نظر رکھے ہوئے تھا، کوفہ میں ایسے واقعات پیش آ رہے تھے جو ایک خطرناک طوفان کا پتا دیتے تھے۔ معاویہ کی بیس سالہ حکومت کے دوران امام علیؑ کے سیکڑوں دوستدار قتل کر دیے گئے تھے اور اتنے ہی یا ان سے بھی زیادہ قید خانوں میں بند تھے۔

جب انہیں معاویہ کے مرنے کی خبر ملی تو انہوں نے سکھ کا سانس لیا۔ وہاں ایسے ابن الوقت لوگ بھی تھے جنہوں نے بزدلانہ طور پر امام علیؑ کو قتل کیا اور ان کے بیٹے امام حسنؑ کا ساتھ چھوڑ دیا تاکہ معاویہ کا جو جی چاہے کرتا رہے۔ چنانچہ "مَنْ اَعَانَ ظَالِماً سَلَّطَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ"[1]

---

[1] جو شخص کسی ظالم کا ساتھ دیگا خدا اس ظالم کو اس پر مسلط کر دیگا (کنز العمال)

کے مطابق جب حکومت معاویہ کو حاصل ہو گئی اور اسے ان بے ضمیر لوگوں کی ضرورت نہ رہی تو اس نے ان پہ توجہ دینا بھی چھوڑ دی۔ ان لوگوں نے بھی اس وقت انتقام لینے کی ٹھان لی تاکہ یزید کے باپ (معاویہ) کے لیے ان کے دلوں میں جو دشمنی تھی اس کا بدلہ بیٹے (یزید) سے لے لیں۔ چنانچہ ان کے اکٹھ ہونا شروع ہو گئے اور شیعان علیؑ سلیمان ابن صرد خزاعی کے گھر جمع ہوئے۔ تب وہاں دھواں دھار تقریریں ہونے لگیں لیکن میزبان کہ جو ایک تجربہ کار شخص تھا اور اپنے شہر والوں کو کئی مرتبہ رنگ بدلتے دیکھ چکا تھا" اس نے کہا: "اے لوگو! اگر تم میں کچھ کر گزرنے کی ہمت نہیں ہے اور اپنی جان کا خوف ہے تو اس شخص (حسینؑ) کو بیکار میں دھوکا مت دو"۔ اس پہ ہر طرف سے آوازیں بلند ہوئیں: "ہم یقیناً اپنی جانوں پر کھیل جائیں گے۔ ہم نے اپنے خون کے ساتھ عہد کیا ہے کہ یزید کو سرنگوں کر دیں گے اور امام حسینؑ کو اس کی جگہ خلیفہ بنائیں گے"۔ آخر کار انہوں نے ایک خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا: "خدا کا شکر ہے کہ اس نے آپ کے ظالم دشمن کا خاتمہ کر دیا۔ وہ ایک ایسا دشمن تھا جس نے رسول اکرمؐ کی امت کے نیک لوگوں کو قتل کیا اور برے لوگوں کو عزت دار بنایا۔ اس نے مسلمانوں کا بیت المال دولتمندوں اور سرکشوں میں تقسیم کر دیا۔ اب آپ کو حکومت حاصل کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ اس شہر کا حاکم نعمان ابن بشیر دارالامارہ میں پڑا ہے۔ ہم نہ اس کے ساتھ مل بیٹھتے ہیں اور نہ ہی نمازیں اس کے ساتھ شریک ہوتے ہیں"۔

فقط ایک ہی خط نہیں تھا جو امام حسینؑ کے کچھ نیک اور مخلص شیعوں نے انہیں بھیجا تھا۔ بلکہ ایسے خطوں کی تعداد سیکڑوں اور

ہزاروں تک بتائی گئی ہے لیکن جن دنوں اہل کوفہ کے قاصد یکے بعد دیگرے مکہ جا رہے تھے اور بعض اوقات ایک ہی قاصد بہت سے خط اپنے ساتھ لاتا تھا۔ ٹھیک انہیں دنوں کوفہ اور دمشق کے درمیان بھی قاصدوں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا جو اپنے ساتھ یزید کے نام خط لے جاتے تھے، جن میں لکھا ہوتا تھا کہ: "اگر کوفہ کو اپنے پاس رکھنا چاہتے ہو تو اس شہر کے لیے ایک طاقتور اور قابل حاکم بھیجو۔ کیونکہ نعمان ابن بشیر ایک کمزور شخص ہے یا اپنے آپ کو کمزور ظاہر کرتا ہے۔

بڑے افسوس کی بات ہے کہ تاریخ نے ان تمام خطوں کا متن جو مکہ اور دمشق بھیجے گئے اور ان لوگوں کے نام جنہوں نے وہ خط لکھے ہمارے لیے ضبط نہیں کیے۔ اگر ہمارے پاس ایسی اسناد ہوتیں یا اگر وہ خطاب تک باقی ہوتے تو یقیناً ہم دیکھتے کہ بہت سے لوگوں نے حفظ ماتقدم کے طور پر اور دوزید کے خوف سے دونوں قسم کے خطوں پر دستخط کر رکھے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اس قسم کا نتیجہ اخذ کرنے کو مصنف کی قنوطیت پر محمول کیا جائے گا لیکن خوش قسمتی سے تاریخ نے مکہ خط لکھنے والوں میں سے چند ایسے اشخاص کے نام ہمارے لیے ضبط کیے ہیں، جنہوں نے امام حسینؑ کو دوسرے خطوں سے زیادہ دلکش الفاظ میں دعوت دی اور پھر ۱۰ محرم کو انہوں نے خط نہ لکھنے والے لوگوں سے بڑھ کر آپ کو مشکل حالات سے دوچار کر دیا۔

اہلِ کوفہ کو امام حسینؑ کا جواب

امام وہ ہے جو قرآن کے احکام کے مطابق عمل کرے،
عدالت کا اجرا کرے اور خدا کو اپنے آپ پر ناظر سمجھے۔
(حسینؑ ابن علیؑ)

جب خطوں کی تعداد غیر معمولی طور پر بڑھ گئی تو امام حسینؑ نے ضروری سمجھا کہ عراقیوں کو زیادہ دنوں تک انتظار میں نہ رکھیں۔ چنانچہ انہوں نے کوفہ کے سرداروں کو ایک جوابی خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا:

ہانی اور سعید آخری قاصد تھے جو تمہارے خط میرے پاس لائے۔ تم نے مجھے لکھا ہے کہ ہمارے پاس آیئے کیونکہ ہمارا کوئی رہبر نہیں ہے، شاید آپ کے آنے سے ہم سیدھے راستے پر چلنے لگیں اور اپنا حق خود اختیاری حاصل کر لیں۔ پس میں اپنے چچا زاد بھائی مسلم بن عقیل کو جس پر مجھے اعتماد ہے تمہارے پاس بھیج رہا ہوں تاکہ وہ مجھے تمہارے متعلق اور جو کچھ

تمہارے شہر میں ہو رہا ہے، اس کے بارے میں اطلاع دے۔ اگر اس نے مجھے لکھا کہ جو کچھ تمہارے خطوں میں لکھا ہے، تمہارے سردار اور دانا لوگ بھی اس کی تائید کرتے ہیں تو میں تمہارے پاس آجاؤں گا۔ میں اپنی جان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ امام وہ ہے جو قرآن کے احکام کے مطابق عمل کرے، عدالت کا اجرا کرے اور خدا کو اپنے آپ پر ناظر سمجھے۔"

مسلمانوں کی خواہش کے مقابلے میں امام حسینؑ کا ردعمل اس مختصر جملے ہی سے سامنے آجاتا ہے کہ: "امام وہ ہے جو قرآن کے احکام کے مطابق عمل کرے اور اجرائے عدالت کا خواہشمند ہو۔" امام حسینؑ اپنی تمام تر زندگی میں اپنے والد بزرگوار کی طرح اجرائے عدالت کے خواہشمند رہے۔ معاویہ کی حکومت کے آغاز ہی سے انہوں نے اس کی بیعت نہیں کی۔ کیونکہ معاویہ ظالم تھا اور مسلمانوں کا پیشوا بننے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا لیکن جب ان کے بھائی امام حسنؑ نے اپنے فوجیوں کا مکر اور چالبازی دیکھ کر معاویہ سے صلح کر لی تو امام حسینؑ نے بھی اس صلح کو قبول کر لیا اور نہیں چاہا کہ مسلمانوں کی وحدت کو ختم کر دیں کیونکہ وہ امام حسن علیہ السلام کو مسلمانوں کا امام برحق سمجھتے تھے اور انکی مخالفت نہیں کرتے تھے۔ مگر اب جبکہ معاویہ مر چکا تھا، اسلامی صوبوں میں سے ایک بہت بڑا صوبہ نئی حکومت سے بیزار تھا اور اس نے آپ کی مدد کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی تھی، امام علیہ السلام نے خاموش بیٹھے رہنا مناسب نہ سمجھا۔ امام حسین علیہ السلام اپنے والد بزرگوار کی طرح دین کے مجاہد تھے اور انہیں سازشکارانہ سیاست سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ دین کو وہی کچھ سمجھتے تھے جو ان کے جد بزرگوار نے اپنی دعوت کے ابتدائی ایام

ہیں بنایا تھا۔ وہ تجاوز کرنے والوں سے کمزوروں کا حق لے کر اجتماعی عدالت کا اجرا کرنا تھا۔ پھر ان دنوں تو پوری اسلامی قلمرو میں اس عدالت کا نام اور نشان تک نظر نہیں آتا تھا۔ دین کے نام پر مکہ، مدینہ، دمشق، کوفہ اور بصرہ کی مسجدوں میں جو رسوم انجام پاتی تھیں وہ ان رسوم سے چنداں بہتر نہیں تھیں جو عرب لوگ رسول اکرمؐ کی بعثت سے پہلے خانہ کعبہ میں انجام دیتے تھے۔ ہاں تو یہ بے روح سی رسوم تھیں جو لوگوں کو فریب میں مبتلا کرنے یا اپنے آپ کو دھوکا دینے کے لیے ادا کی جاتی تھیں لیکن امام حسینؑ اپنے قیام میں خدا کی خوشنودی چاہتے تھے اور اس کے بعد لوگوں کی بھلائی چاہتے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ خدائے تعالیٰ نے عبادت کے نام سے جو کچھ مسلمانوں پر واجب کیا ہے وہ اس لیے ہے کہ انہیں ایسے مسلمان بنا دے جو پاک دل، پاک اعتقاد اور دوسرے مسلمانوں کے خیر خواہ ہوں، تاکہ جس چیز کا اسلام کی روح تقاضا کرتی ہے وہ عملی شکل اختیار کرلے۔ ان کی نظر میں دین کے معنی فقط نماز جمعہ اور اس کے خطبے نہ تھے، جس میں خطیب کی تمام تر کوشش ہوتی ہے کہ اس کے جملے سجع اور قافیے کے ساتھ ادا ہوں۔ وہ دین کو خدا کا مقرر کیا ہوا طریقہ سمجھتے تھے جسے معاشرے میں جاری ہونا چاہیے۔ وہ اسے ایک ایسا قانون سمجھتے تھے جس کی نظر میں تمام لوگ ایک دوسرے کے برابر ہیں اور کوئی نسل کسی دوسری نسل پر برتری نہیں رکھتی۔ اب جبکہ سنت مر چکی تھی اور بدعت زندہ ہو گئی تھی وہ اس گناہ کا سدّباب کر سکتے تھے؛ آپ کا خیال تھا کہ مجھے اس صورتِ حال پر خاموش نہیں رہنا چاہیے کیونکہ آپ کے جد بزرگوار کا ارشاد ہے کہ: اگر کوئی شخص کوئی برا کام ہوتا دیکھے اور اسے روکنے کی طاقت رکھتا ہو تو اسے طاقت کے ساتھ اس کو

نابود کر دینا چاہیے"۔

لہٰذا ان کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ مکر اور ریا کے اس پردے کو چاک کر دیں جو ابو سفیان کے بیٹے اور پوتے نے دعوائے اسلام کے ساتھ اپنے چہروں پر ڈال لیا تھا۔ ان دونوں نے اس دین کو ایک نسلی حکومت کے طور پر متعارف کرایا، جس میں قریش کا مرتبہ دوسروں سے بلند تر تھا۔ امامؑ چاہتے تھے کہ وہ اسلام کا حقیقی چہرہ ظاہر کریں جو ان لوگوں کی رواج دی ہوئی جعلی رسموں کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ تاہم آپ کے راستے میں کئی مشکلات حائل تھیں، مثلاً ایک مشکل تو اس طاغوتی حکومت سے فوجی شکست کھا لینے کی تھی اور اس سے بڑھ کر جان جانے کا خطرہ تھا۔ آپ ان مشکلات کو اس وقت کے سب لوگوں سے بہتر طور پر سمجھ رہے تھے۔ یہاں یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ ایک وقت میں جبریلؑ نے خدا کی جانب سے رسول اکرمؐ کو خبر دی کہ ان کا یہ نواسہ کربلا میں شہید ہو جائے گا۔ پھر اس کی بھی ضرورت نہیں کہ ہم ہاتھ پیر ماریں اور صحیح یا غلط توجیہ کے ساتھ امامؑ سے منسوب ان کلمات کی تاویل کریں یا انہیں رد کر دیں، جن میں انہوں نے اپنے قتل ہونے کی خبر دی ہے۔ کیونکہ اس معاملے کے انجام کو سمجھنے اور پیش نظر حوادث کا تجزیہ کرنے میں ان کی تیز بینی ان کے بھائی محمد حنفیہ، ابن عباس، فرزدق شاعر اور عبداللہ مطیع سے کم نہ تھی جنہوں نے مدینہ مکہ اور عراق کے راستے میں آپ کو کوفہ کے لوگوں کی بے وفائی سے خبردار کیا تھا۔ چنانچہ امام حسینؑ خوب جانتے تھے کہ جس کام کا بیڑا انہوں نے اٹھایا ہے اس کا انجام کیا ہو گا؟ کیونکہ وہ مختصر قطعے، بیت اور چھوٹے چھوٹے جملے جو کبھی کبھی آپ کی زبان پر آجاتے تھے اور جن میں سے ہر ایک

حریت فکر اور آزادیٔ عمل کی چوٹی پر ہیرے کی طرح چمکتا ہے۔ وہ آپ کی اس آگاہی کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ آپ کوفہ کے لوگوں کی وعدہ خلافی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر فرما رہے تھے:

"لوگ دنیا کے بندے ہیں۔ وہ دین کو فقط اس حد تک چاہتے ہیں کہ اس کی بدولت اپنے دنیاوی کام سنوار لیں، مگر جب امتحان کا دن آئے گا تو دیندار بہت تھوڑے ہوں گے"

اسی طرح اس وقت بھی جب مدینہ کے لوگوں نے خلافت کے لیے امام علیؑ کا انتخاب کیا' وہ ہر ایک سے بہتر جانتے تھے کہ انہیں کیا کیا مشکلات درپیش ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ ایک ایسے معاشرے کو سنوارنا کہ جو سراسر بگڑا ہوا تھا' ان کے لیے کتنا مشکل ہے۔ تاہم وہ ایک مخلص مسلمان تھے اور اپنی آسائش کی خاطر مسلمانوں کے مفاد کو کبھی نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے دیکھا کہ مہاجرین اور انصار ان کے گرد جمع ہو گئے اور ان سے بیعت کر لی ہے تو انہوں نے حکومت کی ذمہ داری قبول کر لی۔ امام حسین علیہ السلام بھی اسی باپ کے بیٹے تھے اور وہ اس خوف کے مارے کہ مبادا وہ قتل ہو جائیں اور ان کا قیام بے نتیجہ ثابت ہو ان لوگوں کو ہرگز نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ جو ان کی رہنمائی کے محتاج تھے۔ آپ کوئی سیاست پیشہ شخص نہیں تھے کہ حکومت حاصل کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے، آپ اول و آخر مسلمان تھے اور مسلمان بھی ایسے کہ دوسرے مسلمانوں کے غم خوار تھے۔ چنانچہ انہوں نے وہ کام کیا جس کی ان جیسے آزاد مسلمان سے توقع کی جا سکتی تھی۔ پس ان کے لیے ضروری تھا کہ ان لوگوں کی دعوت قبول کریں اور ان کے پاس جائیں۔ اب یہ ان لوگوں کا فرض تھا کہ جو

پیمان انہوں نے امام علیہ السلام کے ساتھ باندھا تھا، اس کے مطابق آخری دم تک ان کا ساتھ دیں۔ چونکہ ان لوگوں نے امام حسین علیہ السلام کو بے شمار خط بھیج کر ان پر حجت تمام کر دی تھی اس لیے اگر اس پر بیعت و لعل کرتے، موت سے ڈر جاتے اور یزید اور اس کے گماشتوں کو لوگوں پر ظلم ڈھانے کی کھلی چھٹی دیدیتے تو خدائے تعالیٰ کو کیا جواب دیتے؟

بعض قدیم اور موجودہ مؤرخین اور ماہرین عمرانیات کیساتھ — خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم ہوں — ہمارا نقطۂ اختلاف یہی ہے۔ وہ امام حسینؑ کے قیام کو سیاست کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جب کہ انہیں اس قیام سے دین کی حفاظت مطلوب تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک رات میں الجزائر کے شہر تلمسان[1] کے مہمان خانے کی بالکنی پر تاریخ کے معمر مصری پروفیسر ڈاکٹر عبداللہ عنان کے ساتھ بیٹھا تھا کہ دوران گفتگو کربلا اور امام حسینؑ کی تحریک کا ذکر چھڑ گیا۔ تب اس معمر مسلمان نے کہ جس کی تمام عمر تاریخ اسلام کے مطالعے میں گزری تھی، ایک بڑی ہی غیر سنجیدہ بات کہی۔

اس نے کہا: "امام حسینؑ کو ابوالشہداء کا لقب کیوں دیا گیا ہے؟ سیدالشہداء ہونا تو دور کی بات ہے، وہ تو شہید بھی نہیں ہے۔ وہ ایک جاہ طلب آدمی تھا، جس نے اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دیا۔"

---

[1] تلمسان اسی نام کے صوبے کا صدر مقام ہے۔ یہ ایک سرسبز شہر ہے جس میں بہت سے باغات ہیں، اس کی آبادی ایک لاکھ کے لگ بھگ ہے۔

جونہی وہ "ابوالشہداء" کا نام زبان پر لایا، میں سمجھ گیا کہ بدقسمتی سے یہ استاد جس کی عمر کا آفتاب غروب ہونے کو ہے اس کا سینہ اپنے ہم پیشہ کے حسد سے خالی نہیں ہے اور "ابوالشہداء" سے زیادہ اسے ابوالشہداء کے مؤلف سے دلی پرخاش ہے۔

کتاب ابوالشہداء مشہور مصری مصنف عباس عقاد نے لکھی ہے، یہ کتاب تمام عرب مسلم ممالک اور بالخصوص ان ملکوں اور علاقوں میں جہاں شیعہ سکونت پذیر ہیں، بے حد مقبول ہوئی۔ اس کا فارسی میں بھی ترجمہ کیا گیا اور اس سے عقاد کی شہرت میں بہت اضافہ ہوا۔ یوں مجھے معلوم ہوا کہ پروفیسر عثمان کو اس ہستی کی بجائے کہ جس کے نام پر کتاب لکھی گئی عقاد کی وجہ سے زیادہ شکایت ہے۔ اس کے بعد معاویہ اور عمرو بن عاص جیسے گورنروں اور حاکموں کے بارے میں گفتگو ہونے لگی۔ تب میں نے دیکھا کہ پروفیسر عثمان اور اس کے ہم خیال اشخاص جمل، صفین، نہروان اور کربلا کی جنگوں کو دین کی حمایت کے نقطۂ نگاہ سے نہیں بلکہ علاقے فتح کرنے کے نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ ان جنگوں پر اعتراض کرتے ہیں کیونکہ انہوں نے معاملے کے ایک پہلو پر نگاہیں گاڑ رکھی ہیں اور وہ حکومت ہے، خواہ وہ کسی شکل میں بھی ہو اور جس چیز کی طرف وہ نہیں دیکھتے وہ دین ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ کہتے ہیں کہ جس طرح بھی ممکن ہو حاکم طبقے کے اقتدار کی حفاظت کرنی چاہیے۔ انہیں اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ اس اکثریت پر کیا گزرتی ہے جس کو حقوق اور آسائشوں سے محروم کیا جاتا ہے۔

لیکن امام علی علیہ السلام اور ان کے بیٹے امام حسین علیہ السلام

کو حکومت حاصل کرنے کا خیال تک نہ تھا، اس کی کیا وجہ تھی؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ لوگ ان کو حکومت میں لانا نہیں چاہتے تھے۔ ادھر کوفہ کے لوگوں نے امام حسین علیہ السلام کو لکھا:

"پہلے حاکم نے مسلمانوں کا بیت المال دولتمندوں میں تقسیم کر دیا ہے اور حاجتمندوں کو اس سے محروم رکھا ہے۔" انہوں نے یہ بھی لکھا: "عرب کا ایک قبیلہ کسی استحقاق کے بغیر دوسرے عربوں اور مسلمانوں پر اپنی برتری جتاتا ہے اور یہ خدا کی کتاب کی منشاء کے خلاف ہے۔ آپ کو چاہیے کہ یہاں آئیں پھر ہم بھی آپ کی مدد کریں گے۔ تاکہ یہ بدعتیں ختم ہو جائیں۔" جبکہ خود امام بھی یہی چاہتے تھے۔

امام حسینؑ کو معاویہ کی حکومت سے یہی شکایت تھی کہ اس دور میں سنت مٹ گئی اور بدعت زندہ ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ اپنا فرض سمجھتے تھے کہ اگر کوئی مددگار مل جائے تو بدعت کو نیست و نابود کریں۔ پھر اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟ یہ بات خدا پر چھوڑ دیں۔

اگر سیاسی پیش بینی کا سوال ہوتا تو رسول اکرمؐ کو بھی یہ نہیں چاہیے تھا کہ حجاز کے سرداروں کے مقابلے پر اکیلے اٹھ کھڑے ہوں اور انھیں بت پرستی سے روکیں۔ اسی طرح امام علیؑ کو بھی یہ نہیں چاہیے تھا کہ طلحہ و زبیر کو ناراض کریں تاکہ وہ ان سے جدا نہ ہو جائیں اور ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ دین و تقویٰ کا معاملہ یقیناً اور ہے اور حکومت و ریاست کا معاملہ اور ہے۔ علاوہ ازیں امام حسینؑ اپنے بارے میں یزید کی دشمنی سے بھی آگاہ تھے۔ جیسا کہ یزید نے اپنی حکومت کے ابتدائی دنوں میں مدینہ کے حاکم کو لکھا کہ:

"حسینؑ کو اس وقت تک نہ چھوڑو جب تک وہ بیعت نہ کرے اور اگر بیعت نہ کرے تو اسے قتل کر دو۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حاکمِ دمشق انہیں چھوڑنے والا نہیں تھا اور خواہ وہ مدینہ میں رہتے یا مکہ میں وہ انہیں ضرور قتل کرا دیتا۔ یہی وجہ تھی کہ امام علیہ السلام نے ابن زبیر سے کہا: میں مکہ میں نہیں رہونگا کیونکہ میں ڈرتا ہوں کہ مجھے خدا کے حرم میں قتل کر دیا جائے گا اور یوں اس گھر کی حرمت ضائع ہو جائے گی۔

اسی طرح تاریخی حوادث کا تجزیہ کرنے میں یہ بھی انتہائی کوتاہ فکری یا تنگ نظری ہوگی اگر ہم یہ کہیں کہ امام حسینؑ کو عراق میں اپنی فتح کا اتنا یقین تھا کہ وہ اپنی عورتوں اور بچوں کو بھی ساتھ لے گئے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے، بلکہ وہ جانتے تھے کہ جو خطرہ مکہ میں ان کے سر پہ منڈلا رہا ہے، عراق جانے کے بعد وہی خطرہ ان کے پسماندگان کو لاحق ہو جائے گا لیکن فرق یہ تھا کہ اگر وہ مکہ میں رہتے تو حاکم مکہ انہیں مروا ڈالتا یا قید میں ڈال دیتا اور اس نقصان کا کوئی ردعمل نہ ہوتا۔ مگر جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ امام علیہ السلام کی بہنوں کے خطبوں نے جو اثر کوفہ اور شام کے اجتماعات پر کیا، وہ خود ان کے قتل ہو جانے سے کمتر نہ تھا۔

مُسلم بن عقیل کا کوفہ جانا

يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ط
وہ زبان سے وہ کچھ کہتے ہیں جو دل میں نہیں
رکھتے۔ (آل عمران - آیت ۱۶۷)

حضرت مسلم بن عقیل، امام علیہ السلام کا خط لے کر کوفہ روانہ ہو گئے۔ جیسا کہ مورخین نے لکھا ہے شروع شروع میں وہ پیاس اور پانی کی کمیابی سے دوچار ہو گئے اور ان کے دو رہنما مر گئے۔ انھوں نے اس حادثے کو بُرا شگون سمجھا اور امام حسینؑ سے درخواست کی کہ وہ انہیں اس ذمہ داری سے سبکدوش کر دیں۔ امام حسینؑ نے جواب میں لکھا: "ہم اہل بیتؑ شگونوں پر اعتقاد نہیں رکھتے اور انھیں تاکید کی کہ جو کام ان کے سپرد کیا گیا ہے وہ اسے انجام دیں۔
چنانچہ حضرت مسلم کوفہ میں آئے اور مختار ابن ابی عبیدہ ثقفی کے

گھر پر ٹھہرے۔ وہاں کے شیعہ ٹولیوں کی شکل میں مختار کے گھر آتے اور حضرت مسلم انہیں امام حسینؑ کا خط پڑھ کر سناتے تھے۔ وہ لوگ آنسو بہاتے اور ان کی بیعت کرتے جاتے تھے۔ سنی اور شیعہ مورخین نے بیعت کرنیوالوں کی تعداد کے بارے میں مختلف باتیں کہی ہیں اور بعض نے مبالغے سے کام لیا ہے۔ بہرحال زیادہ سے زیادہ جو تعداد بتائی گئی ہے وہ کوفہ کے تمام لوگ ہیں۔ اس سے کم ایک لاکھ اسی ہزار اور سب سے کم بارہ ہزار ہے۔

جب مسلم کو یہ ذمہ داری سونپی گئی تو ان کی عمر ۲۸ سال تھی۔ وہ ایک پرہیزگار اور نیک طینت مسلمان تھے اور واقعی اس نام سے پکارے جانے کے اہل تھے۔ وہ اتنے پختہ عقیدے والے مسلمان تھے کہ احکام دین اور ارشاداتِ رسولؐ کے مطابق عمل کو ہر چیز سے اہم سمجھتے تھے۔ انکی دینداری کے بارے میں اتنا کہنا ہی کافی ہے، چونکہ رسول اکرمؐ نے کسی کو بے خبری کے عالم میں قتل کرنے سے منع فرمایا ہے اس لیے انہوں نے ایک بہترین موقعے سے فائدہ نہ اٹھایا اور شریک کے تہہ خانے سے نکل کر ابن زیاد کو قتل نہ کیا تاکہ اس حکم کی حرمت پامال نہ ہو، حالانکہ اس وقت وہ اسے بڑی آسانی سے قتل کر سکتے تھے۔

علاوہ ازیں یہ پہلی سیاسی ذمہ داری تھی جو انہیں سونپی گئی۔ عراق کی لڑائیوں، اپنے چچا امام علیؑ کی شہادت اور کوفہ کے فوجیوں کی اپنے چچازاد بھائی امام حسنؑ کے ساتھ غداری کے وقت ان کی عمر آٹھ سال تھی، اس لیے وہ ان عیارانہ کارروائیوں میں سے کسی ایک میں بھی موجود نہ تھے۔ چونکہ انہوں نے نفاق اور دورخی کی زندگی نہیں گزاری تھی اس لیے وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایک مسلمان کسی سے

عہد کرے اور پھر اسے وفا نہ کرے۔ مسلمانوں اور ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کا تو کیا سوال ہے، وہ تو ایک مسلمان کے بارے میں بھی ایسا گمان نہیں کرتے تھے۔ چونکہ وہ خود وہی کہتے تھے جو ان کے دل میں ہوتا تھا اور جو کچھ کہتے تھے پورا بھی کرتے تھے۔ اس بنا پر ہرگز یہ باور نہیں کرتے تھے کہ کوفہ کے ہزاروں مسلمان جو بڑے شوق اور جوش کے ساتھ گروہ در گروہ ان کے ہاتھ پر بڑی بینائی سے بیعت کر رہے ہیں، وہ ایک دن ان کو چھوڑ کر منتشر ہو جائیں گے۔ پھر حضرت مسلم کو تو بھیجا ہی گیا تھا اس لیے کہ وہ جو کچھ دیکھیں اس کی اطلاع اپنے چچازاد بھائی امام حسینؑ کو دیں اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔ جب انہوں نے شہر کے لوگوں کی جانب سے اپنا والہانہ استقبال دیکھا تو امام حسینؑ کو لکھا:

"اس شہر کے لوگ واقعی آپ کے حکم کے تابع اور آپ کے پہنچنے کے منتظر ہیں۔"

اور پھر امام حسینؑ حجاز سے عراق روانہ ہو گئے، حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ابن عباس نے انہیں کوفیوں سے خبردار کیا اور کہا: "کوفہ جانے سے باز رہیے۔" اس کی کیا وجہ تھی؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ ابن عباس ایک معمر شخص اور کار آزمودہ سیاستدان تھا۔ اس نے کئی مرتبہ اسلامی شہروں پر حکومت کی تھی اور حالات کے اتار چڑھاؤ سے بخوبی واقف تھا۔ بالخصوص وہ کوفہ کے لوگوں کو اچھی طرح جانتا تھا اور اسے علم تھا کہ یہ لوگ بڑے زور شور سے استقبال کرتے ہیں لیکن بعد میں ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ ان لوگوں نے امام علیؑ کو اس قدر دکھ پہنچایا کہ وہ اپنے تقویٰ اور خودداری کے باوجود اس بات پر مجبور ہو گئے کہ

کئی بار منبر پر کھڑے ہو کر ان سے گلہ کریں اور خدا سے اپنی موت کی دعا مانگیں۔ اس نے دیکھ رکھا تھا کہ ان لوگوں نے کس طرح انہیں تنہا چھوڑ دیا اور ان کے دشمن کو اس بات کا موقع دیا کہ وہ مختلف اطراف سے ان کے زیر تسلّط علاقوں پر حملہ کرے اور مسلمانوں کو لوٹے۔ اس نے دیکھ رکھا تھا کہ یہ لوگ بظاہر کس طرح ان کے بیٹے امام حسنؑ کے گرد جمع ہو گئے لیکن خفیہ طور پر ان کے دشمن کو خط لکھا کہ اگر تم چاہو تو ہم حسنؑ کو دست بستہ تمہارے پاس بھیج دیں۔ چنانچہ جب ابن عباس اپنی رائے دے رہا تھا تو ماضی، حال اور مستقبل اس کی نگاہ کے سامنے تھا اور وہ امام حسینؑ کو کہہ رہا تھا کہ آپ عراق کے لوگوں پر اعتماد نہ کریں۔ ان دونوں مشورہ دینے والوں (مسلم بن عقیل اور ابن عباس) نے جو مشورہ دیا تھا وہ ان کے مشاہدے پر مبنی تھا۔ اگر کچھ فرق تھا تو یہ تھا کہ ایک کی نظر چوتھائی صدی کے واقعات پر تھی اور دوسرا وہی کچھ دیکھ رہا تھا جو اسکی آنکھوں کے سامنے تھا۔

ابن زیاد کا کوفہ آنا

نَكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ

وہ عہد کر چکنے کے بعد اپنی قسمیں توڑ ڈالتے ہیں۔

(توبہ۔ آیت ۱۲)

جب کوفہ سے بھیجے گئے خط دمشق پہنچے تو یزید فکر مند ہو گیا اور اس نے اپنے مصاحبین سے مشورہ کیا کہ اب کیا کیا جائے؟ بعض مؤرخین نے یہ لکھا ہے کہ اس کے رومی مشیر سرجون نے کہا: اگر اس بارے میں تمہارا باپ معاویہ تمہیں کوئی ہدایت دے تو تم کیا کرو گے؟

یزید نے جواب دیا: میں اس کی بات مان لوں گا۔

اس پر سرجون نے اسے معاویہ کا ایک خط دکھایا جس میں لکھا تھا۔ اگر عراق میں کوئی دشواری پیش آئے تو یزید کو چاہیے کہ کوفہ کا انتظام حاکم بصرہ ابن زیاد کے سپرد کر دے۔[1]

---

[1] تاریخ طبری جلد ۷ صفحہ ۲۳۹

ظاہر ہے کہ یہ داستان گھڑنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ معاویہ اتنا ذہین اور دور اندیش تھا کہ وہ ان حادثات کے بارے میں بھی جانتا تھا۔ جو اس کی موت کے بعد رونما ہونیوالے تھے۔

تاہم جو بات درست معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ یزید نے سرجون سے رائے لی اور اس نے کوفہ کی گورنری کے لیے ابن زیاد کا نام تجویز کیا جو اس وقت بصرہ کا حاکم تھا جس کے ساتھ یزید کے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ یزید نے اس کی رائے قبول کر لی اور ابن زیاد کو لکھا کہ کوفہ کی حکومت بھی اس کے سپرد کی جاتی ہے اور جتنی جلد ہو سکے وہ اس شہر کو خاموش کر دے۔

حقیقت یہ ہے کہ سرجون یا جو کوئی بھی یزید کا مشیر تھا، اس نے اس بارے میں غلطی نہیں کھائی۔ عبیداللہ نے ایسے باپ کے زیر سایہ تربیت پائی تھی جو امام علیؑ اور معاویہ کی حکومتوں کے دور میں سالہا سال تک عراق کے شہروں کا حاکم رہا تھا۔ وہ کوفہ اور بصرہ کی دھڑے بندیوں کا سب سے زیادہ علم رکھتا تھا اور جانتا تھا کہ شورش کو دبانے کے لیے ابتدا کہاں سے کرنی چاہیے۔ جاسوس کہاں بھیجنے چاہئیں، کن لوگوں کو قید میں ڈالنا چاہیے اور کن لوگوں کو قتل کروا دینا چاہیے۔ عبیداللہ ابن زیاد ایسے ہی سیاسی ماحول میں پلا تھا اور اس قسم کی حکومت کی باریکیوں سے بخوبی واقف تھا۔

کوفہ میں داخل ہوتے وقت اس نے ایک ایسی چال چلی جس سے اس کی فہانت اور موقع شناسی کا پتا چلتا ہے۔ اس نے ایسا رویہ نہیں اپنایا جس سے پتا چلے کہ وہ خلیفۂ شام کا مقرر کردہ حاکم ہے اور ایک سرکش صوبے کی شورش فرو کرنے آیا ہے بلکہ وہ اپنے آدمیوں کی ایک

جماعت کے ساتھ بصرہ سے روانہ ہوا اور کوفہ پہنچنے سے پہلے اس نے اپنا سر اور چہرہ ڈھانپ لیا۔ جب وہ شہر میں داخل ہو گیا تو لوگوں نے سمجھا کہ یہ حسینؑ ابن علیؑ ہیں جو ان کے پاس آئے ہیں۔ وہ جہاں سے گزرتا لوگ کھڑے ہو جاتے اور کہتے: اے فرزند رسولؐ! خوش آمدید! یہاں لشکر تیار ہیں اور کان آپ کے فرمان کے منتظر ہیں۔

یوں اس نے کوئی تکلیف اٹھائے بغیر کوفہ کے حالات جان لیے اور اسے امام حسینؑ کے طرفداروں کی تعداد، ان کے لیڈروں اور ان کی تیاری کا بھی پتا چل گیا۔

بلاشبہ اگر کوفہ کے لوگوں کو پتا چل جاتا کہ وہ حسینؑ نہیں بلکہ عبید اللہ ابن زیاد ہے تو وہ اسے ہرگز نہ چھوڑتے اور شہر میں داخل ہوتے ہی اس کا کام تمام کر دیتے، لیکن وہ جب تک دار الامارہ نہیں پہنچ گیا اس نے اپنی اصلیت ان پر ظاہر نہیں ہونے دی۔ جونہی وہ محل میں پہنچا، اس کے ایک ساتھی نے بلند آواز سے کہا: دور ہو جاؤ! یہ تمہارا امیر عبید اللہ ابن زیاد ہے۔

اس وقت لوگ سمجھے کہ جس شخص نے اتنی آسانی سے اپنے آپ کو بچا لیا ہے، وہ وہی ہے جو ان کی سرکوبی کے لیے آیا ہے۔ ایک طرف تو وہ افسوس کرتے تھے کہ انھوں نے اتنا نادر موقع گنوا دیا ہے اور دوسری طرف یہ بھی جانتے تھے کہ کیسے مکار اور ہوشیار دشمن سے واسطہ پڑا ہے۔

وہ بارہ ہزار اشخاص کہ جنھوں نے مسلم بن عقیل سے بیعت کی، اگر ان کی بجائے دو ہزار یا پانچ سو تجربہ کار اور دور اندیش افراد کوفہ میں ان کے ساتھ ہوتے تو وہ بے دھڑک محل پر قبضہ کر لیتے۔ ابن زیاد کو گرفتار

کر کے قتل کر دیتے، امام علیؑ کی اولاد کی حکومت کی بنیاد رکھ دیتے اور دمشق کو بتا دیتے کہ صورتِ حال کیا ہے لیکن ان کی اس پسپائی سے ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بیعت کرنیوالے کس قسم کے لوگ تھے۔ ایک طرف تو وہ امام حسینؑ کو لکھتے تھے کہ ہم نعمان بن بشیر سے میل ملاقات نہیں رکھتے، اس کے ساتھ نماز نہیں پڑھتے اور آپ کا انتظار کر رہے ہیں اور دوسری طرف انہوں نے اتنی آسانی سے ابن زیاد کی اطاعت بھی قبول کر لی۔ آخر کیوں؟ اس لیے کہ ان کے یہ دونوں ردِّعمل دونوں حاکموں کے افتادِ مزاج سے مناسبت رکھتے تھے۔ ابن بشیر ایک نرم مزاج، صلح جو اور محتاط آدمی تھا اور اپنے ہاتھ خون سے آلودہ نہیں کرنا چاہتا تھا، جبکہ ابن زیاد ایک سخت دل اور خونخوار شخص تھا جو اپنے دشمن کو کبھی معاف نہیں کرتا تھا۔ جیسا کہ ہم نے اہل کوفہ کی تاریخ میں بارہا پڑھا ہے اور اس کتاب میں بھی بعض مقامات پر اس کا ذکر آچکا ہے، یہ لوگ ظالم حاکم کے سامنے دب جاتے اور جو شخص ان سے نرمی کرتا اس کے سامنے اکڑ جاتے تھے۔ ابن کواء نے ان کے بارے میں کیا ہی خوب کہا تھا:

"وہ ظالم اور بدخواہ کے سامنے عاجز اور مسکین ہیں اور عاجز اور مسکین کے سامنے ظالم اور بدخواہ ہیں۔"

ہانی اور شریک کا کردار

اَلْاِیْمَانُ قَیْدُ الْفَتْکِ
ایمان چھپ کر قتل کرنے سے روکتا ہے۔
(الحدیث)

دوسرے دن صبح کے وقت ابن زیاد مسجد میں گیا اور جیسا کہ اس نے اپنے باپ سے سیکھ رکھا تھا، ایک مختصر لیکن بڑی سخت تقریر کی کہ جس نے ان لاابالی اور زود باور لوگوں پر بڑا گہرا اور فوری اثر کیا۔ اس نے انہیں دھمکی دی کہ اگر وہ نافرمانی کریں گے تو وہ انہیں ہرگز نہیں بخشے گا، لیکن اگر وہ اس کے احکام کے مطابق عمل کریں گے تو اس کی عنایات سے بہرہ مند ہوں گے۔

پھر اس نے حکم دیا کہ ہر محلے کے رئیس جانچ پڑتال کر کے اجنبی لوگوں کی فہرست تیار کریں اور دھیان رکھیں کہ کوئی شخص اس حکم کی خلاف ورزی نہ کرے۔ اس کا دوسرا کام یہ تھا کہ حضرت مسلم بن عقیل کی

خفیہ رہائش گاہ کا پتا چلائے اور اس سے پیشتر کہ وہ کوئی کارروائی کریں ان کا خاتمہ کر دے۔ چنانچہ اس نے معقل نامی ایک غلام کو طلب کیا اور اسے تین ہزار درہم دے کر کہا: "تم مسلم کے ساتھیوں سے راہ و رسم پیدا کرنے کی کوشش کرو اور جب تم کسی ایسے آدمی سے ملو تو اسے کہو کہ میں ایک شیعہ ہوں، مجھے معلوم ہے کہ حضرت مسلم کو ان دنوں مدد کی ضرورت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ رقم انہیں پیش کر دوں تاکہ وہ اسے دشمن کے خلاف جنگ کی تیاری میں استعمال کر سکیں۔

معقل جیسے مشاق جاسوس کے لیے یہ کام چنداں دشوار نہ تھا۔ ان دنوں کوفہ میں کچھ شیعہ بزرگ بہت مشہور تھے۔ اس نے ان میں سے مسلم بن عوسجہ کا انتخاب کیا جو ایک زاہد اور پارسا شخص تھے۔ وہ مسجد میں ان سے ملا، اپنے آپ کو ایک شیعہ کی حیثیت سے متعارف کرایا اور ان سے درخواست کی کہ وہ مسلم سے اجازت حاصل کریں تاکہ وہ ان کی خدمت میں حاضر ہو سکے۔ اس پر ابن عوسجہ نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ شیعیانِ اہل بیتؑ میں سے ایک شخص کو یہ توفیق نصیب ہوئی ہے۔ پھر انہوں نے اسے قسم دلائی کہ وہ اپنی سرگرمیاں پوشیدہ رکھے گا اور کسی کو کچھ بھی نہیں بتائے گا۔ انہوں نے اسے یہ بھی کہا کہ وہ چند دن ان کے مکان پر آتا جاتا رہے تاکہ اس دوران میں وہ اس کے لیے مسلم سے اجازت حاصل کر لیں۔ معقل نے اس بات کا عہد کیا اور قسم بھی کھائی۔ پھر کچھ ہی دن بعد ابن عوسجہ اسے مسلم کے پاس لے گئے۔ انہوں نے وہ رقم اس سے حاصل کی اور بیعت بھی لے لی۔ یوں ابن زیاد کو پتا چل گیا کہ مسلم ابن عقیل کہاں رہ رہے ہیں۔

جن دنوں ابن زیاد کا جاسوس مسلم بن عوسجہ کے پاس جایا کرتا تھا حضرت مسلم، مختار ثقفی کے گھر سے شریک ابن اعور کے گھر منتقل ہو گئے۔ شریک ایک بزرگ اور معروف آدمی تھے اور عبیداللہ ان کا بیحد احترام کرتا تھا۔ جب اس نے سنا کہ شریک بیمار ہیں تو اس نے انہیں کہلا بھیجا کہ آج رات میں آپ کی عیادت کے لیے آؤں گا۔ شریک نے مسلم سے کہا:

"یہ شخص مجھے دیکھنے آرہا ہے، آپ کو چاہیے کہ خفیہ کمرے میں رہیں۔ جب وہ آئے اور میرے پاس بیٹھ جائے تو آپ حملہ کر کے اس کا کام تمام کر دیں اور ہاں ـــــ آپ اس وقت باہر آئیں جب میں پانی مانگوں۔"

چنانچہ حضرت مسلم نے وقتی طور پر یہ تجویز منظور کر لی۔ پھر ابن زیاد شریک کے گھر آیا اور ان سے گفتگو کرنے لگا۔ تب شریک نے پانی مانگا اور منتظر تھے کہ مسلم تلوار کھینچے ہوئے کمرے سے برآمد ہو نگے لیکن انھوں نے ایسا نہ کیا۔ شریک کو فکر ہوئی کہ موقع ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ انھوں نے ایک شعر پڑھا جس کے معنی یہ تھے کہ آپ دیر کیوں لگا رہے ہیں۔

جب انھوں نے وہ شعر کئی مرتبہ دہرایا تو ابن زیاد کو فکر ہوئی اور ڈرا کہ مبادا پس پردہ کوئی کارروائی ہو رہی ہو۔ اس نے حاضرین سے پوچھا کہ شریک کیا کہہ رہے ہیں؟ ہانی ابن عروہ اس وقت وہاں موجود تھے۔ انھوں نے کہا: وہ بیمار ہیں، ان پر ہذیان کی کیفیت طاری ہے اور یہ اشعار وہ اسی ہذیان کی وجہ سے پڑھ رہے ہیں۔ تاہم ابن زیاد نے احتیاط سے کام لیا اور اٹھ کر شریک کے گھر سے باہر نکل گیا۔

جب ابن زیاد چلا گیا تو شریک نے حضرت مسلم سے پوچھا: آپ

نے اسے قتل کیوں نہیں کیا؟

انہوں نے جواب دیا: اس کی وجہ ایک حدیث ہے جو رسول اکرمؐ سے روایت کی گئی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ایک با ایمان آدمی کسی کو بے خبری میں قتل نہیں کرتا۔

ہانی نے کہا: لیکن اگر آپ نے اسے قتل کر دیا ہوتا تو ایک فاسق، فاجر، ظالم اور مکار کو قتل کیا ہوتا!

یوں مسلم، حسینؑ ابن علیؑ، ہانی اور شریک کا سب سے بڑا دشمن اس خطرناک مقام سے بچ نکلا، جہاں وہ خود چل کر آیا تھا۔ وہ اس لیے بچ گیا کہ ایک نیک اور مخلص مسلمان نے جو دین کے احکام پہ صحیح صحیح عمل کرنے کے علاوہ کچھ نہیں سوچتا تھا، اس نے یہ نہیں چاہا کہ اپنی سلامتی اور اپنے مشن کی کامیابی کی خاطر دین کے احکام میں سے کسی حکم کی خلاف ورزی کرے، خواہ اس دینی حکم کی تعمیل سے اس کا اپنا اور بھیجنے والے کا مستقبل خطرے میں پڑ جائے۔

اس واقعہ کے بعد شریک ابن اعور چند ہی دن زندہ رہے اور پھر فوت ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ابن زیاد نے مسلم اور ہانی کو قتل کر دیا تو اسے بتایا گیا: اس رات شریک کے وہ شعر بار بار پڑھنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ چاہتے تھے، مسلم خفیہ کمرے سے نکل کر اسے قتل کر دیں۔ اس نے کہا: خدا کی قسم! اب میں کبھی کسی عراقی کی نماز جنازہ نہیں پڑھوں گا اور اگر میرے باپ زیاد کی قبر اسی قبرستان میں نہ ہوتی جس میں شریک کو دفن کیا گیا ہے تو میں حکم دیتا کہ اس کی قبر کھود ڈالی جائے۔ [1]

---

[1] تاریخ طبری۔ جلد ۷ صفحہ ۲۴۹

شریک کی وفات کے بعد مسلم بن عقیل، ہانی کے گھر چلے گئے۔ معقل وہاں بھی ان کے پاس جایا کرتا تھا۔ وہ ہانی کے گھر سب سے پہلے پہنچتا اور سب کے بعد میں وہاں سے جاتا۔ یوں وہ مسلم اور ان کے شیعوں کی تعداد، ان کی سرگرمیوں اور ان کے فیصلوں کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر لیتا اور یہ سب خبریں عبیداللہ بن زیاد کو پہنچاتا تھا۔ جب ابن زیاد کو مسلم کی خفیہ قیام گاہ، ان کے سر کردہ ساتھیوں اور حمائتیوں کے بارے میں پتا چل گیا تو اس نے اپنی کارروائی شروع کر دی۔ اس نے ہانی کو طلب کیا اور اس سے پوچھا: تم نے مسلم کو اپنے گھر میں کیوں رکھا ہوا ہے؟

ہانی نے پہلے تو ہر بات سے انکار کیا لیکن جب معقل کو ان کے روبرو لایا گیا تو وہ بے بس ہو گئے۔ معقل نے ان کے سامنے کھڑے ہو کر کہا: ہانی! کیا تم مجھے پہچانتے ہو؟

ہانی نے جواب دیا: ہاں پہچانتا ہوں، تم ایک بہت بڑے منافق ہو۔ جب ہانی نے دیکھا کہ انکار کا کوئی فائدہ نہیں تو کہا: میں نے مسلم کو اپنے گھر نہیں بلایا، وہ اطلاع دیے بغیر میرے ہاں آ گئے اور اب میں واپس جا کر ان کو گھر سے نکال دوں گا۔

لیکن ابن زیاد نے یہ بات نہیں مانی اور کہا کہ تم جب تک مسلم کو ہمارے حوالے نہیں کرو گے، تمہیں رہا نہیں کیا جائے گا۔ ابن زیاد اگر ہانی کو رہا کر دیتا تو ممکن تھا کہ وہ مسلم سے کہہ دیتے کہ وہ اس کے گھر سے چلے جائیں لیکن جس بات پر ابن زیاد کو اصرار تھا، اس کا ماننا ہانی کے لیے ناممکن تھا، کیونکہ ایک معروف اور محترم شیخ کے لیے

ممکن نہ تھا کہ وہ اپنے مہمان کو اس کے دشمن کے حوالے کر دے اور اپنے لیے اور اپنے قبیلے کے لیے بہت بڑی شرمندگی مول لے۔ یہ بات بہت بڑھ گئی تو ایک دو شخص بیچ میں پڑے تا کہ ہانی ضد نہ کرے اور مسلم کو ابن زیاد کے حوالے کر دے لیکن وہ نہیں مانے۔ تب ابن زیاد نے ہانی کو اپنے پاس بلایا اور اس کے منہ پر اپنا عصا کھینچ مارا جس سے ان کا چہرہ زخمی ہو گیا۔ پھر حکم دیا کہ ان کو قید خانے میں بند کر دیا جائے۔ ادھر قبیلہ مذحج کو اطلاع ملی کہ ابن زیاد نے ہانی کو قتل کر دیا ہے۔

اس پر مذحجیوں نے سرکاری محل کو گھیر لیا۔ یہ دیکھ کر ابن زیاد ڈر گیا اور اس نے قاضی شریح کو بلا کر کہا: جاؤ اور ہانی کو دیکھو کہ کیا وہ زندہ ہے؟ پھر ان لوگوں کو حقیقت سے مطلع کر دو۔ شریح نے قید خانے میں جا کر دیکھا کہ ہانی زخمی ہیں اور خون میں لت پت ہو رہے ہیں۔ تاہم جب وہ لوگوں کے سامنے آیا تو اس نے فقط اتنا کہا کہ: ہانی زندہ ہے لہٰذا تم لوگ اپنے گھروں کو چلے جاؤ۔ یہ سن کر وہ لوگ اِدھر اُدھر چلے گئے۔

یوں ایک ایسی ناقص گواہی کے ذریعے جو دنیا کے بدلے دین فروخت کرنے والے ایک مسلمان قاضی نے دی، مسلم اور ہانی کے حمایتیوں کے ہاتھوں سے ایک اور موقع نکل گیا۔

جس دن لوگوں نے سرکاری محل کو گھیرا تھا، وہاں چند پہرہ داروں کے علاوہ ابن زیاد کے ساتھ کوئی نہ تھا۔ پس اگر ان لوگوں نے تھوڑی بہت سمجھ بوجھ سے کام لیا ہوتا تو ابن زیاد کا کام تمام ہو جاتا لیکن یہ ایک فطری امر ہے کہ جہاں شور و غوغا بپا ہو جائے، وہاں سے عقل

اور منطق ہر چیز سے پہلے راہ فرار اختیار کرتی ہیں۔ جونہی ہانی کے گرفتار ہونے اور قید خانے میں ڈالے جانے کی خبر شہر میں پھیلی، مسلم بن عقیل سمجھ گئے کہ اب تاخیر مناسب نہیں اور ضروری ہے کہ میں اپنی خفیہ قیام گاہ سے باہر نکل کر جنگ کا آغاز کردوں۔ لہٰذا انہوں نے لوگوں کو آگاہ کرنے کے لیے اپنے مناوی بھیجے۔ جن اٹھارہ ہزار افراد نے ان سے بیعت کی تھی، ان میں سے چار ہزار ہانی کے گھر کے آس پاس جمع ہوگئے تھے۔ ان منادیوں نے یا "منصور امت" لے کا نعرہ لگایا تو مسلم کے مددگار ہر طرف سے آپہنچے، آپ نے انہیں دستوں میں تقسیم کر دیا اور ہر دستے کو ایک شیعہ بزرگ کی ماتحتی میں دے دیا۔ ان میں سے ایک دستہ ابن زیاد کے محل کی طرف روانہ ہو گیا۔

جیسا کہ مؤرخین نے لکھا ہے کہ جب یہ حملہ آور وہاں پہنچے، اس وقت فقط تیس پہرہ دار، ابن زیاد کے لواحقین میں سے بیس اشخاص اور کوفہ کے اکابر محل میں موجود تھے۔ وہ لوگ جنھوں نے محل کا محاصرہ کر لیا تھا اگر وہ جنگجو، عاقبت اندیش اور سوجھ بوجھ والے ہوتے یا ان کے افسر تجربہ کار ہوتے تو وہ اسی وقت محل پر قبضہ کر کے ابن زیاد کو ختم کر دیتے لیکن جیسا کہ میں نے بارہا کہا ہے اور آپ نے پڑھا ہے، یہ اسی قسم کے لوگ تھے جو پہلے کوئی کام کر گزرتے ہیں اور بعد میں جو کچھ ہو

لے یہ نعرہ سورۂ اسراء کی ۳۳ ویں آیت سے ماخوذ ہے: "جو شخص ناحق مارا جائے اس کا وارث اس کا انتقام لینے کا حق رکھتا ہے۔ اسے چاہیے کہ قتل میں (یعنی خون کا بدلہ لینے میں) زیادتی نہ کرے، بیشک وہ منصور ہے۔"

اس کے بارے میں غور کرتے ہیں۔ جب ابن زیاد نے اپنے آپ کو خطرے میں گھرا ہوا پایا تو کوفہ کے تیس سردار جو اس کے پاس موجود تھے، اس نے ان میں سے چند اشخاص کو لوگوں کے پاس بھیجا تاکہ وہ ہجوم کو منتشر کر دیں۔

یہ لوگ بڑے تجربہ کار تھے اور جانتے تھے کہ عاقبت نا اندیش اور شورش پسند لوگوں کو کس طرح باز رکھا جا سکتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کسی ایک گروہ کے پاس گیا اور ان سے کہا: اے لوگو! تم کیا چاہتے ہو؟ کیا کر رہے ہو؟ کیا تمہیں علم نہیں کہ شام کے سپاہی کل یہاں پہنچ جائیں گے؟ کیا تم نہیں جانتے کہ تم شام کے لشکر کے ساتھ نہیں لڑ سکتے؟ جب وہ سپاہی یہاں پہنچیں گے تو تم سے گن گن کر بدلے لیں گے؟

اس وقت ایسا کوئی نہ تھا جو یہ سوچے کہ فی الحال شامی لشکر دارالحکومت میں الجھا ہوا ہے اور اسے حجاز، مصر اور دوسرے علاقوں کی بھی فکر ہے جو بغاوت پر آمادہ ہیں۔ بالفرض اگر وہ لشکر تیار بھی ہوتا اور چل بھی پڑتا تو اسے کوفہ پہنچنے کے لیے ایک مہینہ درکار تھا۔

یہ سیدھا سادہ حساب نہ تو وہ لاپروا لوگ خود جانتے تھے اور نہ ہی اس ہنگامے کی فضا میں کوئی اور ایسا شخص تھا جو انہیں یہ بات سمجھا سکتا۔ اگر کوئی ایسا خیر خواہ ہوتا بھی جو انھیں یہ سب باتیں بتاتا تو خدا جانے وہ اس کا کہا مانتے یا نہ مانتے۔ چنانچہ ان منافق نوابوں، نوابزادوں اور امراء کی دھمکیاں کارگر ثابت ہوئیں اور کوفہ کے نوجوانوں کے ماں باپ آہ وزاری کرتے ہوئے گھروں سے نکلے اور اپنے فرزندوں کو کھینچ کر اندر لے گئے۔

وہاں جو کوئی اپنے فرزند کو دیکھتا تو اس سے کہتا: تمہیں کیا پڑی ہے کہ اس جنگ میں شریک ہوتے ہو؟ یہ سب لوگ جو یہاں ہیں مسلم کی مدد کے لیے کافی ہیں۔ تمہارے نکل جانے سے کیا فرق پڑے گا؟ اس پر اکثر لوگ واقعی ڈر گئے اور میدان چھوڑ کر چلے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جن اٹھارہ ہزار اشخاص نے حضرت مسلم سے اپنی جانیں قربان کر دینے کا پیمان باندھا تھا، مغرب کے وقت تک ان میں سے فقط تیس آدمی ان کے ساتھ رہ گئے اور جب مغرب کی نماز سے فارغ ہوئے تو ایک آدمی بھی آپ کے ہمراہ نہ تھا۔

ہانی اور مسلم کی شہادت

وَ قُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ
کہہ دو کہ تم لوگ اپنے کام کیے جاؤ۔ خدا جلد ہی
تمہارے کاموں کو دیکھے گا۔ (توبہ۔ آیت ۱۰۵)

ابن زیاد اور اس کے ساتھی لوگوں کے ہجوم سے اسقدر خوفزدہ ہوگئے تھے کہ ان کے حضرت مسلم کے پاس سے چلے جانے اور شور و غوغا بند ہو جانے کے بعد بھی وہ محل سے باہر نکلنے کی جرأت نہ کر سکے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلم اور ان کے ساتھیوں نے کوئی جنگی چال چلی ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ یہ لوگ اپنی پناہ گاہ سے باہر آجائیں تاکہ وہ ان کا کام تمام کر دیں۔ جب رات کا کچھ حصہ گزر گیا اور کسی نے ان سے چھیڑ چھاڑ نہیں کی تو انھوں نے مشعل برداروں کو جستجو کے لیے بھیجا۔ مگر بڑی تلاش کے باوجود انہیں لوگوں کا کوئی سراغ نہ ملا۔ انہوں نے واپس آکر

ابن زیاد کو اطلاع دی کہ ہمارے آس پاس کوئی لشکر نہیں ہے۔ جب ابن زیاد کو اطمینان ہو گیا کہ کوفہ کے لوگوں نے مسلم کا ساتھ چھوڑ دیا ہے تو اس نے اپنے دو آدمیوں کو شہر میں بھیجا تا کہ لوگوں کو اطلاع دیں کہ وہ نماز عشاء مسجد میں ادا کریں اور اگر کوئی شخص نہیں آئے گا تو اسے امان نہیں دی جائے گی۔

ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ مسجد لوگوں سے کھچا کھچ بھر گئی۔ ابن زیاد منبر پر گیا اور اس نے دھمکاتے اور لالچ دیتے ہوئے کہا: "اے لوگو! تم نے دیکھا کہ عقیل کے نادان اور بے عقل بیٹے نے شہر میں کیا ہنگامہ برپا کیا اور شہر کے امن و سکون کو کس طرح درہم برہم کر دیا؟ تمہیں یہ جان لینا چاہیے کہ جو شخص اسے اپنے گھر میں پناہ دے گا یا اس کی خفیہ قیامگاہ کا علم ہوتے ہوئے حکومت کو اطلاع نہیں دے گا، اس کا خون مباح ہو گا۔"

پھر اس نے اپنی پولیس کے سربراہ کو مخاطب کر کے کہا: "حصین بن تمیم اگر مسلم تیرے پنجے سے نکل بھاگے تو تیری ماں تجھے روئے، ہاں تمہیں اجازت ہے کہ کوفہ کے ہر گھر میں جاؤ اور تلاشی لو۔"

حضرت مسلم نے مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد جب اپنے آپ کو تنہا پایا تو بے بسی کے عالم میں کوفہ کے گلی کوچوں میں گھومنے لگے۔ وہ جدھر بھی جاتے دیکھتے کہ لوگ راستے پر کھڑے راہ گزروں کی جانچ پڑتال کر رہے ہیں اور خود انہی کی جستجو میں ہیں۔ آخر کار وہ ایک تنگ گلی میں داخل ہو گئے۔ وہ بہت تھک چکے تھے اس لیے ایک مکان کے دروازے پر بیٹھ گئے۔ اور گھر کی مالکہ جس کا نام طوعہ تھا، اس سے پانی مانگا۔ جب

وہ ہانی پی چکے تو اس عورت نے انہیں چلے جانے کو کہا، کیونکہ ان کا ایک ایسے گھر کے دروازے پر بیٹھنا جس کے اندر کوئی مرد نہ تھا کوئی اچھی بات نہ تھی۔ مسلم نے مجبوراً طوعہ سے اپنا تعارف کرایا تو وہ عورت جو شیعیان علیؑ میں سے تھی، انہیں اندر لے گئی اور پناہ دی۔ تاہم رات کے وقت جب اس کے بیٹے نے اسے حضرت مسلم کی طرف آتے جاتے دیکھا تو اسے شک پڑ گیا۔ پھر بڑے اصرار کے بعد اس نے یہ پتا چلا لیا کہ جس شخص کی ابن زیاد کو تلاش ہے، وہ خود اس کے گھر میں اور اس کی ماں کے پاس موجود ہے۔

طوعہ کا بیٹا صبح سویرے ہی ابن اشعث کے پاس چلا گیا جو عبیداللہ ابن زیاد کا ایک قابل اعتماد افسر تھا۔ جب اس نے اسے مسلم کے بارے میں اطلاع دی تو ابن اشعث بہت خوش ہوا اور وہ طوعہ کے بیٹے کو ابن زیاد کے پاس لے گیا۔ تب اس نے اسے بتایا کہ مسلم بن عقیل نے ہمارے گھر میں میری ماں کے پاس پناہ لے رکھی ہے۔

طبری جو ایک قدیم ترین مؤرخ ہے، اس نے یہ قصہ ان تمام تفاصیل کے ساتھ ابو مخنف سے نقل کیا ہے، جو خود اس واقعہ کے وقوع پذیر ہونے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس حادثے کی جو تفاصیل لکھی گئی ہیں وہ درست ہیں یا نہیں؟ لیکن جو بات مسلّم ہے وہ یہ ہے کہ یہ قصہ فرضی نہیں ہے۔ ہانی کے ساتھ ابن زیاد کی تکرار، پھر اسے زخمی کرنا اور قید خانے میں ڈالنا، ہانی کے قبیلے کی شورش اور حضرت مسلم کا مقابلے پر مجبور ہونا، بیعت کرنے والوں کا ابن زیاد کے محل کو گھیر لینا اور پھر ٹولیوں اور گروہوں کی شکل میں منتشر ہو جانا اور مسلم کو تنہا چھوڑ دینا۔ یہ سب کچھ امر فطری معلوم ہوتا ہے اور ان

حوادث کا ذکر جس انداز میں کیا گیا ہے، بہ اسی طرح وقوع پذیر ہوئے۔ جو شخص کوفہ کے لوگوں کی ذہنیت سے واقف ہو اور جس نے ایسی تحریکوں کی تاریخ پڑھ رکھی ہو جو بے وقت اور کسی منصوبے کے بغیر شروع کی جائیں، وہ مطمئن ہو جاتا ہے کہ مجموعی طور پر یہ داستان شروع سے آخر تک درست معلوم ہوتی ہے۔ یقیناً یہ حادثہ سیکڑوں لوگوں نے دیکھا ہر ایک نے اس کی تفصیل اپنے طور پر بیان کی اور پھر تاریخ نے اسے ضبط کیا ہے۔ تاہم جہاں تک جزئیات کا تعلق ہے مثلاً مشعل بردار اشخاص کا محل سے باہر آنا اور کسی کو نہ دیکھنا یا مسلم کا کوفہ کی گلیوں میں سرگرداں پھرنا اور ان کی طوعہ سے گفتگو وغیرہ کے بارے میں جو کچھ ضبط تحریر میں لایا گیا ہے، ممکن ہے کہ وہ اصل واقعات سے مختلف ہو۔ بہرحال تمام مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ اسی صبح کو ابن زیاد کے سپاہی حضرت مسلم کو گرفتار کرنے طوعہ کے گھر پہنچ گئے۔

جیسے ہی ابن زیاد کو مسلم بن عقیل کی پناہ گاہ کا پتا چلا، اس نے محمد بن اشعث کو ساٹھ یا ستر آدمیوں کے ساتھ انہیں گرفتار کرنے کے لیے بھیجا۔ حضرت مسلم نے طوعہ کے گھر کے اندر ہی سے گھوڑوں کی ٹاپیں اور سپاہیوں کی آوازیں سنیں تو سمجھ گئے کہ وہ لوگ انھیں گرفتار کرنے آئے ہیں۔ ایسے موقع پر ان کا فرض تھا کہ سب سے پہلے اس بات کا اہتمام کریں کہ گھر کی مالکہ کو حملہ آوروں کے ہاتھوں کوئی نقصان نہ پہنچے۔

چنانچہ وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے، تلوار کھینچ کر ان لوگوں پر حملہ کیا اور انہیں طوعہ کے گھر سے باہر دھکیل دیا۔ ابن زیاد کے سپاہیوں

نے جب ان کی دلاوری اور شمشیر زنی دیکھی تو مکانوں کی چھتوں پر چڑھ گئے۔ پھر اوپر سے آگ اور پتھر برسا کر انہیں زخمی کر دیا لیکن اس کے باوجود حضرت مسلم نے اطاعت قبول نہیں کی۔ اس پر ابن اشعث نے کہا: اے مسلم! اپنے آپ کو قتل مت کراؤ۔ اب تم امان میں ہو اور کوئی شخص تم سے چھیڑ چھاڑ نہیں کرے گا۔

مسلم نے جواب دیا: میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں ایک آزاد شخص کی حیثیت سے مارا جاؤں گا۔ موت خواہ کتنی ہی ناخوشگوار چیز کیوں نہ ہو، ہر انسان کو ایک دن اس کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔ ہر آرام کے ساتھ تکلیف لگی ہوئی ہے، میں نہیں چاہتا کہ تم مجھے فریب دو یا مجھ سے جھوٹی باتیں کرو۔

ابن اشعث نے دوبارہ کہا: نہ کوئی تمہیں فریب دینا چاہتا ہے، نہ کوئی تمہیں قتل کرنا چاہتا ہے اور میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ تم امان میں ہو۔ اس کے ساتھ جو دوسرے لوگ تھے ان سب نے بھی یہی بات کہی، بجز عمر بن عبداللہ بن عباس کے جس نے کہا میں اپنے آپ کو اس معاملے میں شریک نہیں کرتا۔

آخر کار انھوں نے مسلم کو ایک خچر پر سوار کیا۔ ان کی تلوار لے لی اور انہیں محل کی طرف لے چلے۔ اس وقت مسلم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ شخص جو انہیں امان دینے کے معاملے میں دوسروں کے ساتھ شریک نہیں ہوا تھا، اسی نے ان سے کہا: "اے مسلم! جو شخص حکومت حاصل کرنے کے لیے اٹھا ہو، اگر اسے ایسے انجام سے دوچار ہونا پڑے تو اسے رونا نہیں چاہیے!"

مسلم نے جواب دیا: "خدا کی قسم! میں اپنے لیے نہیں رو رہا۔ میں تو ان لوگوں کے لیے رو رہا ہوں جن کو میں نے خط لکھا اور اس میں اہل کوفہ کی طرف سے حمایت کے وعدے پر ان کی حوصلہ افزائی ہوئی ہے اور اس وقت وہ عراق کے راستے میں ہیں۔" پھر انہوں نے محمد بن اشعث سے کہا: "بندۂ خدا! میں جانتا ہوں کہ تم نے مجھے امان دینے کا جو وعدہ کیا ہے اسے پورا نہیں کر سکو گے۔ پھر بھی میں درخواست کرتا ہوں کہ تم خود امام حسینؑ کو ایک خط لکھو اور جو کچھ مجھ پر گزری ہے انہیں اس سے مطلع کر دو۔ انہیں لکھو کہ آپ عراق کے لوگوں سے فریب نہ کھائیں، یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے آپ کے والد بزرگوار کو اس قدر آزردہ کیا تھا کہ وہ ان کے ہاتھ سے موت کی آرزو کیا کرتے تھے۔ آپ کو جہاں بھی یہ خط ملے وہیں سے واپس لوٹ جائیں اور اپنے آپ کو خطرے میں نہ ڈالیں۔"

ابن اشعث نے کہا: "خدا کی قسم میں ایسا ہی کروں گا اور میں ابن زیاد سے بھی کہوں گا کہ میں نے تمہیں امان دی ہے۔"

طبری لکھتا ہے کہ ابن اشعث نے وہیں سے ایک آدمی کو خط دے کر امام حسین علیہ السلام کے پاس بھیج دیا اور اس کا یہ قاصد منزل زبالہ میں امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضرت مسلم کو جو کچھ پیش آیا تھا اس کی اطلاع انہیں دی لیکن یہ داستان بلا شبہ جھوٹ ہے۔ اول تو امام علیؑ کے خاندان سے ابن اشعث کے کوئی اچھے تعلقات نہیں تھے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جنگ صفین میں اس کے باپ نے امام علیؑ کے ساتھ کس طرح غداری کی اور اس بات کا بھی قوی احتمال ہے کہ اشعث بن قیس امام علیؑ کے قتل کی سازش سے لاتعلق نہ تھا۔ علاوہ ازیں یہ ممکن

نہیں تھا کہ محمد بن اشعث اپنے حاکم ابن زیاد کی اجازت کے بغیر حسینؑ ابن علیؑ کو خط لکھتا اور نہ ابن زیاد اسے اس بات کی اجازت دینے والا تھا۔ ممکن ہے کہ قبیلۂ کندہ کے کچھ لوگوں نے یہ کہانی گھڑی ہو تاکہ ان کے سردار کے بیٹے نے جو کام کیا اس کی برائی کو کسی حد تک گھٹا سکیں۔

مسلم کو اس حالت میں ابن زیاد کے محل میں لایا گیا کہ جنگ کی تھکن، زخموں سے خون بہنے اور گرم موسم کی وجہ سے انہیں سخت پیاس لگی ہوئی تھی۔ ابن زیاد کے محل کے دروازے کے پاس انہیں پانی کا ایک کوزہ نظر آیا اور انھوں نے لوگوں سے کہا کہ وہ انہیں پانی کا ایک گھونٹ پلا دیں۔ ایک شخص جو ان لوگوں میں سے تھا جو ہر روز اپنا قبلہ بدلتے ہیں اور ہر گھڑی نیا رنگ اختیار کرتے ہیں، خدا جانے اس نے کتنے خط حسینؑ ابن علیؑ کو لکھے تھے اور انہیں عراق آنے کی دعوت دی تھی۔ وہ حضرت مسلم سے کہنے لگا: "تم اس پانی کا ایک قطرہ بھی نہ پیو گے بجز اس کے کہ دوزخ میں جا کر حمیم جہنم پیو۔"

مسلم کو اس شخص کی بے حیائی اور قساوت قلبی پر بے حد تعجب ہوا اور انھوں نے اس سے پوچھا: "تم کون ہو؟"

اس نے جواب دیا: "میں وہ شخص ہوں کہ جب تم نے حق سے انکار کیا تو اس نے اسے قبول کیا، جب تم نے اپنے امام (یعنی یزید) کی مخالفت کی تو اس نے اس کی اطاعت کی، جب تم نے نافرمانی کی تو اس نے فرمانبرداری کی اور میں مسلم ابن عمر باہلی ہوں۔"

افسوس ہے کہ تاریخ بہت سی معمولی باتیں تو ثبت کرتی ہے لیکن جو اہم واقعات لکھنے چاہئیں ان پر خاموش رہتی ہے۔ مجھے اس بات کا

علم نہیں کہ آیا یہ باہلی شخص مختار اور شریک کے گھر گیا یا نہیں اور اس نے مسلم سے بیعت کی یا نہیں؟ لیکن اس نے جس بے حیائی اور ڈھٹائی کے ساتھ مسلم کو جواب دیا، وہ ایسے کمینے لوگوں کی عادات و اطوار کو ظاہر کرتی ہے، جنہیں اپنے ماضی کا خوف ہوتا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ اپنے مستقبل کے لیے نئی حکومت میں کوئی مقام حاصل کر لیں۔ یہ شخص بھی اگر چند دن پہلے مسلم کے پاس نہ گیا ہو گا اور ان سے بیعت نہ کی ہو گی تب بھی بلاشبہ اس نے کسی واسطے اور وسیلے سے آئندہ کے لیے اس جماعت میں جگہ پیدا کر لی ہو گی۔" تاہم حضرت مسلم نے کہا:

"اے باہلی! تم کتنے سخت دل، تند مزاج اور ظالم ہو، تم ہمیشہ دوزخ میں رہنے کے لیے مجھ سے زیادہ سزاوار ہو۔"

بالآخر مسلم کو محل میں لایا گیا اور ابن اشعث نے ابن زیاد سے کہا:

"میں نے اسے امان دی ہے۔"

ابن زیاد نے جواب دیا: "تم اسے امان دینے یا نہ دینے کا کیا حق رکھتے ہو؟ میں نے تمہیں اسے گرفتار کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ امان دینے کے لیے نہیں۔

یہاں ایک ایسے نکتے کا ذکر کرنا ضروری ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ آدھی صدی کی مدت میں اسلامی معاشرہ کس طرح مکمل طور پر ٹوٹ گیا۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ جب مدینہ میں حکومت اسلام کی بنیاد پڑی تھی، اس وقت سے مسلمانوں میں ایک مسلمہ اصول رواج پا گیا تھا، جس کی توثیق رسول اکرمؐ نے بھی کر دی تھی کہ اگر کوئی مسلمان کسی کو امان دیتا تو تمام مسلمان اس امان نامے کے پابند ہوتے تھے۔ مکہ کے

محاصرہ کی رات جب عباس بن عبد المطلب، ابو سفیان کو ساتھ لیکر رسول اکرمؐ کی خدمت میں آئے تو عمر بن خطاب نے اسے قتل کرنا چاہا اور کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ تم میرے قابو میں آگئے ہو اور کسی مسلمان کی امان میں نہیں ہو۔ اس پر عباسؓ نے کہا: نہیں ایسا نہیں ہے، میں نے اسے امان دی ہے۔ اس پر عمر بن خطاب کو سر تسلیم خم کرنا پڑا اور ابو سفیان کی جان بچ گئی۔

لیکن آدھی صدی گزرنے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ جب ابو سفیان کے پوتے کا ایک عامل یہ سنتا ہے کہ ایک ایسا شخص جو بظاہر مسلمان ہے اس نے رسول اکرمؐ ہی کے ایک پوتے کو امان دی ہے تو وہ کہتا ہے: اس امان کی کوئی وقعت نہیں اور اس بظاہر مسلمانوں کے مجمع میں سے ایک شخص نے بھی اٹھ کر یہ نہیں کہا کہ امان کا قبول کرنا مسلمانوں میں ایک مسلمہ اصول ہے اور جب محمد نے مسلم کو امان دی ہے تو تمہیں چاہیے کہ اس امان کو قبول کر لو۔

اس وقت اس منحوس اور غیر انسانی اجتماع میں جو گفتگو اس عالی مرتبت مظلوم اور ان بے شرم ظالموں کے درمیان ہوئی وہ ایک جانب سے متاثر کن اور دوسری جانب سے حیرت انگیز ہے۔ حیرت انگیز اس لحاظ سے ہے کہ ایک شخص اپنے آپ کو رسول اکرمؐ کے جانشین کا نمائندہ سمجھتا ہے اور وہ وہی ہے جو خود اور اس کا باپ کچھ عرصہ پہلے اس بات پر فخر کرتے تھے کہ وہ اسی مظلوم کے چچا (امام علیؑ) کے خدمت گاروں میں سے ہیں، جسے اس نے ہاتھ بندھوا کر اپنے سامنے کھڑا کر رکھا ہے لیکن آج بغیر اس کے کہ اس نے کوئی جرم کیا ہو جس کے لیے وہ اسلام میں ایسی

سزا کا حقدار ہو، اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا جا رہا ہے۔

اسی دوران میں ابن زیاد کو خیال آیا کہ ممکن ہے مسلم کی موجودہ حالت کو دیکھ کر حاضرین میں سے سخت دل رکھنے والوں پر بھی رقت طاری ہو جائے۔ اگرچہ اس کا یہ وہم بے جا تھا، پھر بھی دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے اس نے حاضرین کے جذبات کو مسلم کے خلاف بھڑکانا چاہا اور کہا: "کیا تم وہی نہیں جو مدینہ میں شراب پیتے تھے؟"

کم ظرف لوگوں کا یہ شیوہ ہے کہ جب منطق میں ہار جاتے ہیں تو تہمت کا سہارا لیتے ہیں۔

مسلم طیش میں آنے کی بجائے ابن زیاد کی بے شرمی پر حیرت زدہ رہ گئے اور کہا: ابن زیاد! میں اور شراب پیوں؟ شراب خوری کا سزاوار مجھ سے زیادہ وہ شخص ہے جو مسلمانوں کا خون پیئے، بیگناہوں کو قتل کرنے اور محض تہمت اور گمان کی بنا پر آزاد مردوں کو گرفتار کرنے اور تکلیفیں پہنچانے میں کوئی باک نہیں رکھتا۔ پھر نہ صرف یہ کہ کبیرہ گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے اور پشیمان نہیں ہوتا بلکہ یوں ظاہر کرتا ہے جیسے کہ اس نے کبھی کوئی بُرا کام کیا ہی نہیں۔"

جب ابن زیاد نے دیکھا کہ تہمت کا تیر کارگر نہیں ہوا تو اس نے پینترا بدلا اور ایک ایسی بات کہی جس میں حاضرین خواہ مخواہ اس کی ہمنوائی کریں۔ اس نے کہا: "تو ایک ایسی چیز چاہتا ہے جس کے قابل خدا کسی دوسرے کو سمجھتا ہے۔"

مسلم نے کہا: "اچھا ــــ جو اس کے قابل ہے وہ کون ہے؟"

ابن زیاد نے جواب دیا: "امیر المومنین یزید!"

مسلم نے کہا: "اس بات میں میرے اور تمہارے درمیان خدا فیصلہ کرے گا۔"

ابن زیاد نے دیکھا کہ اس دفعہ بھی وہ عاجز ہو گیا ہے اور جو مقصد وہ حاصل کرنا چاہتا ہے وہ حاصل نہیں کر سکا۔ اب اس نے مسلم پر اپنی طاقت کا رعب جمانا چاہا اور کہا: "خدا کی قسم! میں تجھے اس طرح قتل کروں گا کہ مسلمانوں میں کسی کو بھی اس طرح قتل نہیں کیا گیا ہو گا۔"

مسلم نے جواب دیا: "تم اسلام میں بدعتیں نکالنے اور وہ کام کرنے کی دوسروں سے زیادہ طاقت رکھتے ہو جو پہلے لوگوں نے نہیں کیے۔"

اس مرتبہ بھی ابن زیاد نے شکست کھائی اور جیسا کہ جاہلوں کا طریقہ ہے کہ جب مد مقابل کے سامنے کوئی دلیل پیش نہیں کر سکتے تو گستاخی پر اتر آتے ہیں۔ لہٰذا اب اس نے حسینؑ، امام علیؑ اور عقیلؓ کو گالیاں دیں۔ پھر مسلم نے کچھ نہ کہا اور خاموش رہے۔

اس غم انگیز منظر کے خاتمے کے بارے میں ہم مختصر طور پر لکھتے ہیں۔ ابن زیاد نے مسلم اور ہانی کو قتل کرانے کے بعد حکم دیا کہ ان کے پاؤں میں رسیاں باندھ کر انہیں کوفہ کے بازاروں میں گھسیٹا جائے۔ کیا کہا جا سکتا ہے کہ شاید ان لاشوں کو کھینچنے والوں میں چند اشخاص ایسے بھی ہوں جنہوں نے اس مظلوم ہاشمی مسلمان کی بیعت کر رکھی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ یہ خدمت انجام دے کر اس تہمت کا داغ دھو ڈالیں اور نئے امیر کو خوش کریں یا اس پر ظاہر کریں کہ وہ ہمیشہ ظالم حاکم

کے نوکر ہے اور اب بھی ہیں۔ یہاں فقط ایک نکتے کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ جو ایک اور لحاظ سے ان پچاس سالوں میں اسلامی معاشرے کی گراوٹ کا پتہ دیتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس موقع پر حضرت مسلم کو اپنی وصیت کی فکر ہوئی۔

اسلام میں وصیت ایک مشروع امر ہے جو کبھی واجب کبھی مستحب اور کبھی مباح ہوتا ہے۔ اس لیے وصایت کا قبول کرنا بھی ایک قابلِ ستائش کام ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اس مجلس میں سے کئی آدمی اٹھ کھڑے ہوتے اور ان میں سے ہر ایک حضرت مسلم کی وصیت کو پورا کرنے کا وعدہ کرتا، تاہم ان بزدل لوگوں میں سے کوئی ایک بھی نہ اٹھا۔ تب مجبور ہو کر انہوں نے خود حاضرین پر نگاہ ڈالی تاکہ اس مقصد کے لیے ان میں سے کسی ایک کو چن لیں لیکن سوال یہ تھا کہ وہ کس پر اعتماد کریں کیونکہ وہ جس شخص کی جانب بھی دیکھتے، اس کی طرف سے امید کی کوئی کرن نظر نہ آتی تھی۔ آخر کار انہوں نے عمرو بن سعد کو مخاطب کر کے کہا: ہماری تمہاری آپس میں رشتہ داری ہے، اس لیے تم آؤ اور میری وصیت سنو۔ عمرو نہ مانا اور ابن زیاد کی خوشامد کے لیے ان کی بات ان سنی کر دی حتیٰ کہ ابن زیاد نے اسے وصیت سننے کی اجازت دے دی۔

اس پر حضرت مسلم اسے ایک کونے میں لے گئے اور کہا:

۱۔ میں کوفہ میں سات سو درہم کا مقروض ہوں، تم میری چیزیں بیچ کر یہ قرض ادا کر دینا۔

۲۔ میری میت ایک گوشے میں زمین میں دفن کر دینا۔

۳۔ امام حسینؑ کو ایک خط لکھنا اور کہنا کہ وہ کوفہ میں نہ آئیں۔

ان تینوں باتوں کا موضوع سیاسی نہ تھا کہ ان کے افشا نہ کرنے سے ابوسفیان کے خاندان کو کوئی نقصان پہنچتا، لیکن یہ کم ظرف وصی جس کے باپ (سعد بن ابی وقاص) کو عشرہ مبشرہ میں شمار کیا جاتا ہے، اس دن اخلاقی گراوٹ کے اس درجے پہ پہنچ گیا تھا کہ جب وہ حضرت مسلم کے پاس سے واپس آیا، ابن زیاد سے کہنے لگا: "کیا تمہیں معلوم ہے کہ مسلم نے مجھ سے کیا کہا ہے؟" عبیداللہ نے جواب دیا: "بعض اوقات لوگ خائن کو امین سمجھتے ہیں اور اسے اپنا وصی بناتے ہیں۔ اگر مسلم مجھے اپنا وصی بناتا تو وہ جو کچھ چاہتا میں اسے انجام دیتا۔" ابن زیاد کا یہ کہنا بھی جھوٹ تھا اور وہ فقط یہ چاہتا تھا کہ عمر سعد کو اس مجلس میں حاضرین کے سامنے ذلیل و رسوا کرے۔

امام حسینؑ کی عراق روانگی

مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ الْمُنْکَرَ فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ

تم میں سے جو کوئی بدی کو دیکھے، اس کو قوت بازو سے روکے۔

(کنز العمال)

کوفہ میں حضرت مسلم کا اتنی گرمجوشی سے استقبال ہوا کہ اس سے زیادہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جب انہوں نے لوگوں کا جوش و خروش دیکھا تو اپنے چچا زاد بھائی کو ایک خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا:

"قافلے کا رہنما کبھی بھی اپنے لوگوں سے جھوٹی بات نہیں کہتا۔ اس شہر کے لوگ متفقہ طور پر آپ کے پیرو ہیں اور آپ کے احکام کے منتظر ہیں۔ آپ کو چاہیے کہ جتنی جلد ہو سکے یہاں آنے کے لیے روانہ ہو جائیں۔"

امام حسینؑ کو اہل کوفہ کی جانب سے فصیح عبارات میں لکھے ہوئے پے در پے خطوط بھی آ چکے تھے، جن میں انہیں کوفہ پہنچنے کی تاکید کی گئی تھی۔ نیز ان خطوط سے اہل کوفہ کے امام علیہ السلام کی خاطر جنگ کرنے اور انہیں

مسند حکومت پر بٹھانے کے اشتیاق کا اظہار ہوتا تھا۔ اس خط سے جو کوفہ میں ایک عینی شاہد اور خود امام علیہ السلام کے سفیر اور نمائندے کا بھیجا ہوا تھا، امامؑ کی ذمہ داری واضح ہو گئی اور وہ یہ کہ انہیں ضرور عراق جانا چاہیے۔ اتفاقاً انہیں دنوں میں انہیں ایک اور حادثے کی خبر ملی جس نے ان کا حجاز چھوڑ دینے کا ارادہ پختہ کر دیا۔ یعنی انہیں پتا چلا کہ یزید کے پیادے مکہ پہنچ گئے ہیں تاکہ مراسم حج کی ادائیگی کے دوران ان پر اچانک حملہ کر کے انہیں قتل کر دیں۔ پس آپ کے لیے قیام کے مقدمات ہر لحاظ سے آمادہ ہو چکے تھے اور ان کی ترتیب یہ تھی:

۱۔ امام علیہ السلام نے دوسرے دو مہاجر بزرگوں اور بزرگ زادوں کی طرح یزید کی بیعت نہیں کی تھی اور اس کی حکومت کو رسمی طور پر تسلیم نہیں کیا تھا، لہٰذا ان پر اس شخص کے بارے میں جو مسلمانوں کی پیشوائی کا دعویٰ کرتا تھا کوئی شرعی اور اخلاقی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی تھی۔

۲۔ آپ اپنے آپ کو ان دو اشخاص کے مقابلے میں مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے موزوں تر سمجھتے تھے اور یہ ایک ایسی حقیقت تھی جسے عام لوگوں کے علاوہ امامت کے وہ دونوں مدعی بھی قبول کرتے تھے۔

۳۔ آپ یزید کو ایک فاسق، فاجر اور نالائق شخص سمجھتے تھے۔ جس نے نفط، سازش، فریب، دباؤ اور شام کے لوگوں کی حمایت سے جس کی صورت اندھا دھند اطاعت کی تھی، ایک ایسا حق غصب کر لیا تھا جس کا وہ اہل نہ تھا۔

۴۔ یزید کا مسلمانوں پر تسلط اور اس کا خلافت کا دعویٰ واضح طور پر ناجائز تھا، کیونکہ اس کی حکومت کی بنیاد مسلمانوں کے مشورے، رسول اکرمؐ

کی قرابت یا اس کی شخصی قابلیت پر نہ تھی۔ اس کی یہ ولی عہدی اور جانشینی ایک بدعت تھی جسے کوئی متدین مسلمان قبول نہیں کرنا چاہتا تھا۔

۵ ــــــ بدعت کو مٹانا اور ناجائز فعل کو نابود کرنا یوں تو ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے۔ مگر امام حسینؑ جو رسول اکرمؐ کے نواسے تھے، ان پر ذمہ داری دوسروں کے مقابلے میں زیادہ عائد ہوتی تھی۔

۶ ــــــ ایک ناجائز کام کو روکنے میں تاخیر کرنا اس وقت روا ہے جب کہ ایک شخص ایسے قیام کے لیے ضروری طاقت نہ رکھتا ہو۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بیس سال تک معاویہ کے مقابلے میں خاموش رہے، جو اپنے بیٹے کی طرح مسلمانوں کے حقوق ضائع کرنے والا شخص تھا لیکن اب جب کہ انہیں کافی قوت حاصل ہوگئی تھی، ان کے لیے ضروری ہوگیا کہ کسی مزید تاخیر کے بغیر اس ناجائز فعل کے مقابلے پر اٹھ کھڑے ہوں۔

۷ ــــــ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، امام حسین علیہ السلام بھی اپنے والد بزرگوار کی طرح مجاہد اسلام تھے اور اپنے قیام میں خدا کی رضا اور مسلمانوں کی آسائش کے طالب تھے۔ وہ کوئی سیاسی آدمی نہیں تھے کہ فقط طاقت حاصل کرنے کے بارے میں سوچتے اور وہ بھی ہر اس طریقے سے جس سے اس کا حصول ممکن ہوتا، جیسا کہ ہم جانتے ہیں جب لوگوں نے امام علیؑ کی بطور خلیفہ بیعت کی تو ان کا پہلا اقدام یہ تھا کہ انہوں نے معاویہ کو دمشق کی حکومت سے معزول کر دیا۔ اگرچہ ان کے مشیروں نے کہا کہ ایسا کرنے میں انہیں چند مہینوں کی تاخیر کرنی چاہیے تاکہ ان کی حکومت مضبوطی سے قائم ہو جائے، لیکن انہوں نے

جواب دیا: "مجھے یہ گوارا نہیں کہ معاویہ ایک لحظہ بھر کے لیے بھی مسلمانوں پر ظلم ڈھائے۔"

۸۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں امام حسین علیہ السلام جانتے تھے کہ یزید کسی طرح بھی انہیں چھوڑنے والا نہیں ہے اور اب جب کہ انہوں نے اس کی بیعت نہیں کی اور مدینہ سے مکہ چلے آئے ہیں، اس نے اپنے پیادے بھیجے ہیں تاکہ وہ انہیں حج کے موقع پر اچانک قتل کر دیں۔ اگر وہاں ان کا خون بہایا جاتا تو اسلامی معاشرے میں بیک وقت دو ناروا کام ہو جاتے۔ ایک تو یہ کہ خدا کے گھر کی حرمت مجروح ہوتی اور دوسرے یہ کہ خود نواسۂ رسولؐ کا خون رائیگاں جاتا جب کہ اس بابرکت مقام پر چرند اور پرند امان میں ہیں اور کسی کو ان سے تعرض کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

ان تمام مقدمات کے فراہم ہونے سے امام حسینؑ کی ذمہ داری واضح ہو گئی اور وہ یہ کہ انہیں عراق جانا چاہیے۔ جب ابن عباس کو معلوم ہوا کہ امام حسین علیہ السلام کا ارادہ عراق جانے کا ہے تو اس نے آپ سے کہا: "میرے چچا کے بیٹے! جن لوگوں نے آپ کو بلایا ہے، کیا انہوں نے اپنے حاکم کو شہر سے نکال دیا ہے، خزانوں پر قبضہ کر لیا ہے اور آپ کے آنے کے منتظر ہیں؟ اگر ایسا ہے تو آپ عراق بخوشی جائیں لیکن اگر یزید کا مقرر کردہ حاکم اپنے عہدے پر موجود ہے اور لوگ اس کی اطاعت کر رہے ہیں اور سرکاری واجبات اسے ادا کر رہے ہیں تو آپ کو وہاں نہیں جانا چاہیے، کیونکہ ممکن ہے آپ کے جانے پر حاکم آپ کا مقابلہ کرے اور جنگ کی نوبت آ جائے۔ اس وقت وہ لوگ آپ کا ساتھ چھوڑ دیں گے اور

اس کی مدد کریں گے۔

جو سیاست داں حکومت کا خواہش مند ہو اس کے لیے ایسا مشورہ ایک سوچی سمجھی اور قابل توجہ تدبیر ہے، لیکن جو چیز امام حسین علیہ السلام چاہتے تھے وہ حکومت نہیں بلکہ ناجائز کاموں کے خلاف جنگ تھی۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ ناجائز کاموں کے خلاف جنگ کرنا مسلمان کی ذمہ داری ہے لیکن اگر اس کام کے لیے ایک بہت بڑی فوج آراستہ کرنے کی ضرورت ہو تو اس فوج کے نظم و نسق اور اس سے کام لینے کے لیے ایک رہنما کی ضرورت ہو گی اور امام علیہ السلام اس رہنمائی کی اہلیت اپنے اندر پاتے تھے۔ اگر کوفہ کے لوگ خود شورش برپا کر کے یزید کو حکومت سے ہٹا دینے کے قابل ہوتے تو انہیں اس بات کی ضرورت نہ تھی کہ وہ آپ کو دعوت دیں کہ آپ ان کے پاس آئیں اور تحریک کی قیادت سنبھالیں۔

جن دنوں کوفہ سے مکہ کی جانب خطوں کا تانتا بندھا ہوا تھا امام حسینؑ نے بھی بصرہ کے کچھ رؤسا کو خط لکھے اور انہیں اپنی مدد کے لیے بلایا۔ قبیلہ بنی سعد اور بنی حنظلہ میں سے دو رؤسا نے اپنے اپنے قبیلے کے ساتھ ان کی مدد کی حامی بھر لی، لیکن انہوں نے اس میں اتنی دیر کر دی کہ جب وہ کوچ کی تیاری کر رہے تھے، اس وقت انہیں امام علیہ السلام کے قتل ہو جانے کی اطلاع مل گئی تھی۔

امامؑ کے قافلے میں ان کے قریبی رشتہ داروں کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی شامل ہو گئے، جب یہ قافلہ روانگی کے لیے تیار ہو گیا تو مکہ کے حاکم کو اس کی خبر مل گئی۔ تب اس نے اپنے آدمی بھیجے جو راستے میں جا کر امام حسینؑ سے ملے اور ان سے کہا:

آپ کیوں اختلافِ کلمہ پیدا کر رہے ہیں، کیوں معاشرے کا سکون برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں؟

امام حسینؑ نے جواب میں فقط قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی:

"میں اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہوں اور تم اپنے عمل کے خود ذمہ دار ہو۔ میں تمہارے عمل سے بیزار ہوں اور تم میرے عمل سے بیزار ہو۔" (سورۂ یونس۔ آیت ۴۱)

ابن زبیر بھی ظاہرداری کے طور پر امام حسینؑ کے پاس آیا اور کہنے لگا: اگر آپ چاہیں تو یہیں رہیں، میں تمام معاملات آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ لیکن امام حسین علیہ السلام نے اس کی باتوں پر کوئی خاص توجہ نہ دی، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ابن زبیر نے یہ بات دل سے نہیں کہی ہے علاوہ ازیں بات حکومت اور ریاست کی نہیں تھی کہ اگر عراق میں میسر نہ آئے تو حجاز میں ہی حاصل ہو جائے۔

جب قافلہ روانہ ہو گیا تو اس امر کی اطلاع امام حسینؑ کے چچازاد بھائی عبداللہ بن جعفر طیار کو ملی۔ انہوں نے ایک طرف تو امام علیہ السلام کو خط لکھا کہ جانے میں جلدی نہ کریں تاکہ وہ (عبداللہ) خود آکر ان سے مل سکیں، دوسری طرف وہ حاکم مکہ کے پاس گئے اور اس سے امام حسینؑ کے لیے امان نامہ حاصل کیا۔ پھر وہ حاکم مکہ عمرو بن سعید کے بھائی یحییٰ بن سعید کے ہمراہ امام حسینؑ کی خدمت میں پہنچے اور ان سے درخواست کی کہ وہ عراق جانے سے باز رہیں۔

یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ امان نامے کا متن اور اس بارے میں امام حسینؑ کا جواب بھی نقل کیا جائے کیونکہ یہ دونوں چیزیں بڑی اہم ہیں۔

حاکمِ مکہ نے لکھا:

"میں نے سنا ہے کہ آپ عراق جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ آپ تفرقہ پیدا کرنے سے باز رہیں، کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ اس کشمکش میں آپ مارے جائیں گے۔ میں عبداللہ بن جعفر اور یحییٰ بن سعید کو آپ کے پاس بھیج رہا ہوں تاکہ وہ آپ کو بتائیں کہ آپ میری امان میں ہیں اور آپ میری صلۂ رحمی، حسن سلوک اور حمایت سے بہرہ مند ہوں گے!"

امام حسینؑ کی طرف سے اس خط کا جیسا جواب ہو سکتا تھا وہ صاف ظاہر ہے۔ چنانچہ انہوں نے لکھا:

"جو شخص لوگوں کو خدا اور رسولؐ کی اطاعت کی طرف بلائے اور نیکوکاری کو اپنا شعار بنالے وہ پھوٹ ڈالنے والا ہرگز نہیں ہو سکتا اور ایسا کرنے میں وہ خدا اور رسولؐ کی مخالفت کرنے والا نہیں ہوتا، ہاں تو بہترین امان خدا ہی کی طرف سے ہے۔ جو شخص دنیا میں خدا سے نہیں ڈرتا وہ قیامت کے دن اس کی امان میں نہیں ہوگا۔ میری خدا سے دعا ہے کہ میں دنیا میں اس سے ڈروں تاکہ آخرت میں اس کی امان سے بہرہ مند ہو سکوں۔ تم نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ تم میرے لیے صلۂ رحمی اور بھلائی کا ارادہ رکھتے ہو، خدا تمہیں دنیا اور آخرت میں اس کی جزائے خیر دے۔"

قافلے کی مکہ سے عراق روانگی کے دن سے لے کر مسلم اور ہانی کے قتل ہو جانے کی خبر ملنے سے پہلے تک دو تین آدمیوں کی ملاقات امامؑ سے ہوئی۔ جب آپ نے ان لوگوں سے عراق کے حالات دریافت کیے تو انہوں نے جواب دیا۔ "لوگوں کے دل آپ کے ساتھ اور تلواریں

بنی امیہ کے ساتھ ہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ جو لوگ اس قافلے کی عراق روانگی کے وقت اس میں شامل ہوئے ان کی صحیح تعداد کیا تھی؟ چونکہ اس زمانے میں تاریخ کے لیے ان تفاصیل کی کوئی اہمیت نہ تھی اس لیے انہیں ضبط نہیں کیا گیا۔ حالانکہ اگر یہ تفاصیل لکھ دی جاتیں تو بہت قیمتی ثابت ہوتیں۔ تاہم جیسا کہ ہم نے گزشتہ ابواب میں کہا ہے کہ حجاز اس قیام میں شریک ہونے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس لیے عین ممکن ہے کہ چند با ایمان اشخاص ہی امامؑ کے ہمراہ ہوئے ہوں اور ان کے علاوہ کچھ ایسے مصلحت پرست لوگ بھی امامؑ کے ساتھ ہو گئے ہوں جنہوں نے اس پیشوا کے مستقبل پر نگاہیں گاڑ رکھی تھیں۔

جیسا کہ فرزدق اور عمرو بن العاص کے بیٹے کی گفتگو سے پتا چلتا ہے، مکہ میں ایسے لوگ بھی تھے جو امام حسینؑ کی فتح کو یقینی سمجھتے تھے۔ فرزدق کہتا ہے: میں نے حسینؑ بن علیؑ کو ساز و سامان کے ساتھ مکہ سے باہر دیکھا اور ان سے کہا: "آپ اتنی جلدی اور حج کیے بغیر کیوں جا رہے ہیں؟" انہوں نے فرمایا: "اگر میں جلدی نہ کروں تو گرفتار ہو جاؤں گا۔" پھر انہوں نے مجھ سے پوچھا: "تم کون ہو؟" میں نے جواب دیا: "میں عراق کا رہنے والا ہوں۔" انہوں نے مجھ سے اس بارے میں مزید کچھ نہیں پوچھا۔ پھر فرمایا: "تم نے عراق کے لوگوں کو کس حال میں پایا؟" میں نے جواب دیا: "ان کے دل آپ کے ساتھ اور تلواریں بنی امیہ کے ساتھ ہیں اور آخری فیصلہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔" پھر میں نے احکامِ حج کے بارے میں چند مسائل ان سے پوچھے۔

میں امام حسینؑ سے رخصت ہو کر سیدھا عبداللہ بن عمرو بن عاص

کے خیمے میں پہنچا اور اسے اپنی اس ملاقات کے بارے میں بتایا۔ اس نے کہا: "تم ان کے ساتھ کیوں نہ چلے گئے؟ وہ ضرور حکومت حاصل کرلیں گے۔"

جب میں نے عبداللہ کے یہ الفاظ سنے، مجھے خیال آیا کہ میں امام حسین علیہ السلام کے ساتھ ہو جاؤں لیکن پھر میں گزشتہ پیغمبروں کے قتل کیے جانے کے متعلق سوچنے لگا اور امام حسینؑ کے ساتھ جانے سے باز رہا۔ پھر کچھ زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ میں نے سنا انہیں قتل کر دیا گیا ہے۔[1]

مجھے علم نہیں کہ یہ داستان کس حد تک حقیقت پر مبنی ہے۔ اس کا پہلا حصہ تو مسلم ہے، کیونکہ اس کا ذکر تمام اسناد میں ہے لیکن اس زمانے کے حالات دوسرے حصے کی بھی تائید کرتے ہیں اور کم از کم مکہ کے کچھ لوگوں کے نزدیک امام حسینؑ کے لیے فتح اور شکست میں فتح کا احتمال زیادہ تھا۔

یہ بھی مسلم ہے کہ عراق کے راستے میں بصرہ، کوفہ اور دوسرے شہروں کے کچھ لوگ جو اس سال حج کرنے آئے تھے، اعمال حج کی تکمیل کے بعد اس قافلے میں شامل ہو گئے۔

---

[1] طبری جلد ۷ صفحہ ۲۷۸

امام حسینؑ اور لشکرِ حُر

خُطَّ الْمَوْتُ عَلَی ابْنِ آدَمَ مَخَطَّ الْقِلَادَةِ عَلٰی جِیْدِ الْفَتَاةِ

موت فرزند آدم کو اسی طرح نشان زدہ کرتی ہے، جیسے ایک جوان عورت کی گردن پر گلو بند کا نشان پڑ جاتا ہے۔

(حسینؑ ابن علیؑ)

امام حسینؑ کو حضرت مسلم کے قتل ہو جانے کی خبر کب اور کہاں ملی؟

اس بارے میں طبری نے اپنی ایک روایت میں لکھا ہے:

"قادسیہ سے تین میل دور حر بن یزید ریاحی نے اپنے زیر کمان ایک دستے کے ساتھ امامؑ کا راستہ روکا اور پوچھا: "آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

امام حسینؑ نے فرمایا: "کوفہ جا رہا ہوں"

حرؑ نے کہا: آپ واپس چلے جائیں کیونکہ مجھے وہاں آپ کے لیے بہتری کی کوئی امید نہیں ہے۔

پھر اس نے امام حسینؑ کو مسلم کے مارے جانے کی خبر دی۔ امامؑ نے واپس جانا چاہا لیکن مسلم کے بھائی نہیں مانے اور کہنے لگے: "ہم اپنے بھائی کے خون کا بدلہ ضرور لیں گے"۔

اس پر امام حسین علیہ السلام نے فرمایا: "تمہارے بعد زندگی میں کوئی مزا نہیں"۔[1]

ظاہر ہے کہ اس مؤرخ کے راویوں میں سے کسی ایک نے کئی باتوں کو ایک دوسری کے ساتھ گڈ مڈ کر دیا ہے۔ جو چیز صحیح معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ امام حسین علیہ السلام کو مسلم کے مارے جانے کی اطلاع حُر کے ساتھ ملاقات ہونے سے کئی دن پہلے مل گئی تھی۔ نیز یہ بات بھی مسلّم ہے کہ حُر اس بات پر مامور تھا کہ امام علیہ السلام کا راستہ روکے اور انکی نگرانی کرتا رہے، حتیٰ کہ اس کو ابن زیاد سے نئے احکام پہنچ جائیں۔ رہا یہ کہنا کہ ابن زیاد نے عمرو بن سعد سے حضرت مسلم کی وصیت سنکر کہا: "اگر حسینؑ ہم سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کریںگے تو ہم بھی ان سے کوئی تعرض نہیں کریںگے"۔ یہ ایک جھوٹی روایت ہے جو ابن زیاد سے منسوب کی گئی ہے یا ابن زیاد نے یہ بات وقتی مصلحت کے مطابق کہی ہے۔ ہم عبیداللہ ابن زیاد کو اچھی طرح جانتے ہیں اور اس کی اور اس کے باپ کی امام علیؑ کے خاندان سے دشمنی سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ امام علیؑ کی خلافت میں زیاد کچھ مدت کے لیے ان کی طرف سے عامل تھا اور اپنی ذمہ داریاں بھی اچھی طرح انجام دیتا تھا لیکن جب اس نے معاویہ کی ماتحتی اختیار کی اور بالخصوص جب اسے ابوسفیان

---

[1] طبری جلد ۷ صفحہ ۲۸۱

کا حرامی بیٹا ہونے کے باعث معاویہ کا بھائی کہلانے کا شرف حاصل ہوا تو اس نے اپنی فکر اور طاقت کو اخلاص کے طبق میں رکھا اور معاویہ کو پیش کر دیا۔ عبیداللہ اسی باپ کا بیٹا تھا، وہ چاہتا تھا کہ امام علیؑ کے شیعاؤں سے وہی سلوک کرے جو اس کا باپ کیا کرتا تھا۔ یہ ممکن نہ تھا کہ وہ امام حسینؑ کو چھوڑ دیتا کہ وہ جہاں چاہیں چلے جائیں۔

لہٰذا یہ جو طبری نے حُر کی زبانی لکھا ہے کہ: "آپ واپس چلے جائیں کیونکہ مجھے وہاں آپ کے لیے بہتری کی کوئی امید نہیں ہے"۔ یہ وہی اطلاع ہے جو چند اشخاص نے امام علیہ السلام کو راستے میں دی اور انہیں حضرت مسلم کے مارے جانے کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ اس کے برعکس وہ روایات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہیں، جن میں کہا گیا ہے کہ ابن زیاد نے کوفہ، شام اور حجاز کے تمام راستوں کی نگرانی شروع کر دی تھی اور حکم دیا تھا کہ ہر آنے جانے والے کی جانچ پڑتال کی جائے۔

اسی طرح یہ بات بھی بعید بلکہ ناممکن نظر آتی ہے کہ محمد بن اشعث یا عمرو بن سعد نے حضرت مسلم کی وصیت پر عملدرآمد کرتے ہوئے امام حسینؑ کو خط لکھا ہو اور انہیں مسلم کے مارے جانے کی اطلاع دی ہو۔ کیونکہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ محمد بن اشعث ابن زیاد کی اجازت کے بغیر ایسا خط کبھی نہ لکھتا اور ابن زیاد کو بھی یہ کام انجام دینے دلانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

بہرحال کچھ بھی ہوا، جب امام حسینؑ کو پتہ چلا کہ مسلم اور ہانی کے علاوہ آپ کے دو قاصد بھی قتل کر دیے گئے ہیں، جو انہوں نے کوفہ والوں کو اپنی آمد کی اطلاع دینے بھیجے تھے۔ تب آپ نے اپنے تمام ساتھیوں کو جمع کیا اور اس مجمع میں وہ کام انجام دیا جس کی توقع ان جیسے آزاد شخص سے

کی جا سکتی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ ان میں سے بعض اشخاص جو حجاز سے ساتھ ہو گئے تھے یا راستے میں آپ سے مل گئے تھے، انہوں نے یہ سفر خدا کی رضا کے لیے اختیار نہیں کیا، لہٰذا آپ نے چاہا کہ ان لوگوں کے دلوں کو سکون بخشیں۔ جیسا کہ ہم نے اس کتاب کے مختلف ابواب میں کئی دفعہ لکھا ہے، جب مسلمان ایک امام کی بیعت کرتے ہیں تو وہ ایک ایسا عہد ہوتا ہے جس پر انہیں زندگی کے آخری لمحے تک کاربند رہنا پڑتا ہے۔ امام علیہ السلام نے چاہا کہ ان لوگوں کو اس عہد کی پابندی سے آزاد کر دیں۔ چنانچہ آپ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"ہمیں ایک دردناک خبر ملی ہے کہ مسلم اور ہانی مارے گئے اور دوستوں نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ اب تم لوگ خود فیصلہ کرو اور جو شخص آخر تک ہمارے ساتھ نہ رہنا چاہتا ہو وہ جدھر چاہے چلا جائے۔"

تب کچھ لوگ چلے گئے اور وہ گھٹیا لوگ تھے جو دنیا کے طالب تھے۔ جو لوگ امام کے ساتھ رہ گئے وہ سچے مسلمان تھے۔

منزل شراف میں آرام کرنے کے بعد قافلے نے وہاں سے کچھ پانی حاصل کیا اور پھر تقریباً آدھے دن تک سفر جاری رکھا۔ اس دوران میں ایک شخص نے اچانک نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ امام حسینؑ نے فرمایا: "خدا کا نام لینا ہر حال میں اچھی بات ہے، لیکن اس وقت تیرے تکبیر کہنے کا کیا سبب ہے؟"

اس شخص نے جواب دیا: "مجھے سامنے ایک نخلستان دکھائی دے رہا ہے۔"

قافلے والوں نے کہا: "اس راستے پر کوئی نخلستان نہیں رہا، جو کچھ

تم دیکھ رہے ہو وہ لازماً کوئی اور چیز ہے۔ جب وہ آگے بڑھے اور خوب غور سے دیکھا تو ایک آدمی نے کہا: ”جو چیزیں ہم دیکھ رہے ہیں وہ نیزوں کے پھل اور گھوڑوں کے کان ہیں۔“

پس جس چیز کو وہ نخلستان سمجھ رہے تھے، دراصل دشمن کا ہراول دستہ تھا۔ جن لوگوں کو چاہیے تھا کہ خوشی مناتے اور تکبیر پڑھتے ہوئے اپنے عزیز مہمان کا استقبال کرتے“ وہ ہتھیار سجا کر اس کے خلاف جنگ کرنے آئے تھے۔ کتنی عجیب ہے یہ دنیا اور کتنے بدعہد تھے وہ لوگ!

یہ درست ہے کہ مؤرخین نے لکھا ہے، جب امام حسینؑ نے کوفہ والوں کے دعوت نامے حر کو دکھائے تو اس نے کہا: ”مجھے ان خطوں کا کوئی علم نہیں ہے لیکن کیا یہ بات باور کی جا سکتی ہے کہ ایک شہر کے ایک لاکھ بیس ہزار افراد ایک ہفتے کی مدت میں ایک شخص کا ساتھ دینے پہ آمادہ ہو جائیں اور اس عظیم واقعے کی خبر محلوں، مسجدوں اور گلی کوچوں تک نہ پہنچے! اور سبھی یا بیشتر لوگوں کو اس کا پتا نہ چلے؟ ہم مانے لیتے ہیں کہ خود حرؔ کو اس چیز کی کوئی خبر نہ تھی لیکن وہ ایک ہزار آدمی جو اس کے ساتھ تھے کیا ان میں سے بھی کسی کو چند ہفتے پہلے شہر میں جو کچھ ہوا اس کا پتا نہیں تھا؟ آخر کوفہ کی آبادی کتنی تھی؟ کیا اس ساری آبادی میں جنگجو اشخاص فقط چند ایک تھے۔ تاکہ ہم یہ فرض کر لیں کہ ان ایک ہزار اشخاص میں سے کوئی بھی ان میں سے نہیں تھا۔ تاہم ایسے مفروضے پر مشکل سے ہی یقین کیا جا سکتا ہے۔

بہرحال اس ملاقات سے المیے کی ابتدا ہو گئی۔ جب حرؔ نے قافلہ سالار کا راستہ روکا تو امام علیہ السلام نے فرمایا: ”ان لوگوں نے مجھے

اپنے ہاں بلایا ہے تاکہ میں ان کی مدد سے ان بدعتوں کا خاتمہ کر دوں جو خدا کے دین میں پیدا ہو گئی ہیں۔ یہ ان کے خط ہیں اور اگر اب وہ پشیمان ہیں تو میں واپس چلا جاتا ہوں۔"

حُر نے کہا: "میں خط لکھنے والوں میں سے نہیں ہوں اور نہ ہی مجھے ان خطوں کا کوئی علم ہے۔ میرے امیر نے مجھے یہ ذمہ داری سونپی ہے کہ جہاں کہیں آپ کو دیکھوں، آپ کا راستہ روکوں اور آپ کو اس کے پاس لے جاؤں۔ ظاہر ہے کہ امام حسینؑ اس کی یہ تجویز قبول نہیں کر سکتے تھے اور اس نے بھی انہیں آزاد نہیں چھوڑا تاکہ واپس حجاز چلے جائیں۔ حتیٰ کہ انہیں اس بات کی بھی اجازت نہیں دی کہ کسی آباد اور سرسبز مقام پر پڑاؤ ڈالیں، تاہم جو کچھ اس ملاقات اور گفتگو میں گزرا اس میں ایک بڑا قابلِ غور پہلو نظر آتا ہے۔ یہ وہ نکتہ ہے جس کا مسلمان علمائے اخلاق نے ہمیشہ ذکر کیا ہے اور مسلمانوں کو اس سے ڈرایا ہے۔ قرآن مجید میں بھی چند مقامات پر اس کی جانب اشارہ ہوا ہے کہ ہر انسان اپنی عمر کے ہر مرحلے میں ہوائے نفس کی پیروی اور قانون شکنی کا شکار ہو جاتا ہے۔ جب وہ شروع میں کوئی گناہ کرتا ہے تو اسے ضمیر کی سرزنش کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اس کے دل پر ایک تاریک پردہ پڑ جاتا ہے لیکن وہ پردہ اتنا تاریک اور سیاہ بھی نہیں ہوتا کہ آئندہ کوئی سچی بات اس کے کانوں میں اتر ہی نہ سکے۔ کہتے ہیں کہ اس حالت میں انسان کا دل حقیقت کو نہیں دیکھ پاتا لیکن اس کا اعتقاد صحیح و سالم ہوتا ہے اور اگر وہ گناہ کرنے سے باز آجائے تو یہ سیاہی بتدریج چھٹ جاتی ہے لیکن اگر وہ گناہ کرنے پر مصر ہو تو پھر یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ نہ صرف گناہ کرتے سے اس کے ضمیر کو کوئی کچو کا نہیں لگتا بلکہ گناہ

سے اسے لذت حاصل ہوتی ہے۔ اس مٹھ بھیڑ میں اگرچہ لشکر کے سردار اور اس کے سپاہیوں نے امام علیہ السلام کا راستہ روکا اور وہ ان کے ساتھ ایک گرفتار شدہ شخص جیسا سلوک کر رہے تھے لیکن جب نماز کا وقت آتا تو وہ انہیں امام کہتے اور ان کی اقتدا کرتے تھے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ امام حسینؑ دین سے خارج نہیں ہوئے اور وہ مسلمان تھے، بلکہ آپ نمازِ جماعت پڑھانے کے لیے قانونی حاکم کے بھیجے ہوئے شخص کے مقابلے میں زیادہ اہل ہیں۔ پھر اس واقعہ کو چند دن بھی نہیں گزرتے کہ یہی لوگ آہستہ آہستہ خدا کے احکام کی خلاف ورزی پر زیادہ سے زیادہ دلیر ہو جاتے ہیں اور جتنا اس راستے پر آگے بڑھتے ہیں اتنا ہی خدا سے دُور ہو جاتے ہیں۔ یوں رفتہ رفتہ ان کے دل زیادہ سیاہ اور زیادہ سخت ہو جاتے ہیں، ان کے دلوں کو ایک ایسا پردہ ڈھانپ لیتا ہے کہ پھر ایمان کی روشنی ان پر نہیں چمکتی۔ اسی پردے کے بارے میں قرآن مجید فرماتا ہے:

"كَلَّا بَلْ .... لَمَحْجُوبُونَ"

ایسا نہیں ہے بلکہ جو کچھ انہوں نے کیا (گناہ) وہ ان پر غالب آگیا۔ ایسا نہیں ہے۔ بلاشبہ وہ اپنے پروردگار سے حجاب میں ہیں۔ (سورۂ مطففین آیات ۱۴-۱۵)

یہ پردہ اتنا موٹا اور تاریک ہوتا ہے کہ کوئی روشنی اس پر اثر نہیں کرتی اور کوئی سچی بات اس میں داخل نہیں ہو سکتی۔ معرکۂ کربلا کے آخری لمحات میں جب امام علیہ السلام کا ایک ساتھی ان لوگوں سے جن میں وہ ہزار آدمی بھی شامل تھے جنہوں نے اسی امامؑ کی اقتدا میں کئی مرتبہ باجماعت

نماز ادا کی تھی، تھوڑی سی مہلت مانگتا ہے تاکہ وہ اور اس کے ساتھی اپنے امام کے ساتھ آخری نماز پڑھ لیں تو آوازیں آتی ہیں کہ: "تمہاری نماز خدا کی درگاہ میں قبول نہیں ہے"۔ خدا کی پناہ! ہوائے نفس انسان کی آنکھوں اور کانوں کو کس طرح بند کر دیتی ہے اور حقیقت کو اوندھا کر کے پیش کرتی ہے۔

قصر بنی مقاتل میں امام حسین علیہ السلام نے ایک خیمہ دیکھا اور پوچھا کہ یہ خیمہ کس کا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ حر جعفی کے بیٹے عبید اللہ کا ہے۔ امام حسینؑ نے اسے بلوا بھیجا لیکن اس نے آنے سے انکار کر دیا اور کہا: "میں کوفہ سے اس لیے باہر آگیا ہوں کہ اس کشمکش میں شرکت نہ کروں اور میں جانتا ہوں کہ اس کا انجام کیا ہوگا"

تب امام حسین علیہ السلام خود اسے ملنے گئے اور اس سفر میں اسے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ تاہم وہ نہیں مانا اور اس کی بجائے امامؑ سے کہا کہ وہ اس کی تلوار اور گھوڑا قبول کر لیں، اس کے بعد امام حسینؑ نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ یوم عاشورہ کے سانحہ کے بعد عبید اللہ ہمیشہ افسوس کرتا رہا کہ اس نے اتنا بڑا موقع کیوں گنوا دیا' اس بارے میں کچھ اشعار بھی اس سے منسوب کیے جاتے ہیں۔

کربلا میں دو لشکروں کا پڑاؤ

اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ط
(سورۂ مجادلہ۔ آیت ۱۹)

شیطان نے ان پر قابو پالیا اور خدا کی یاد ان کے دلوں سے بھلا دی۔

ان تمام اختلافات کے باوجود جو روایات کی جزئیات میں دیکھنے میں آتے ہیں، اگر ہم امام حسینؑ کے یزید کی بیعت کرنے سے انکار، ان کی مدینہ سے مکہ روانگی، کوفہ کے لوگوں کے دعوت ناموں کی موصولی، مسلم کے بھیجے جانے اور امامؑ کی مکہ سے عراق روانگی سمیت اس حادثہ کے بارے میں قدیم تاریخ نویسوں نے شروع سے آخر تک جو کچھ لکھا ہے، اگر ہم اسے خارجی قرائن کے مطابق پرکھیں تو ممکن ہے کہ کچھ حوادث پر زیادہ روشنی پڑ سکے۔ گزشتہ ابواب میں کوشش کی گئی ہے کہ جہاں تک

ہو سکے ان گوناگوں روایات کا وہ حصہ نقل کیا جائے جس پر تمام یا بیشتر تاریخ نویسوں کا اتفاق ہے لیکن جب قافلے کے مکہ سے عراق کی جانب سفر کا آغاز ہوتا ہے تو ہم جوں جوں آگے بڑھتے ہیں، تاریخی حقائق پر تاریکیوں کا پردہ زیادہ گہرا ہوتا جاتا ہے۔ بالخصوص حُر بن یزید اور اس کے لشکر کے ساتھ اس قافلے کا سامنا ہونے سے کربلا میں جنگ کے خاتمہ تک کی روایات ایک دوسری سے اس قدر متناقض اور بے جوڑ ہیں کہ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں واحد مشترک نقطہ یہی ہے کہ لڑائی دسویں محرم سنہ ۶۱ھ کو لڑی گئی اور امامؑ کے ساتھیوں میں سے ہر وہ شخص جو بلوغت کی عمر کو پہنچ چکا تھا آپ کے ساتھ قتل ہو گیا۔ باقی رہا اختلاف کا معاملہ تو وہ یہاں تک ہے کہ شیعہ اور سنی مورخین اس بارے میں بھی متفق نہیں ہیں کہ حضرت علیؑ ابن الحسینؑ کو کیوں قتل نہیں کیا گیا؟ ان روایتوں کے متناقض ہونے کی وجہ معلوم ہے اور وہ یہ ہے کہ پہلی تحریری سند جو ہمارے پاس موجود ہے، جس کے نسخے اب تک باقی ہیں، وہ اس حادثے کے کم از کم دو سو سال بعد لکھی گئی تھی۔ اب خدائے تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ بنی امیہ کے دور میں ان کی حکومت سے وابستہ تاریخ نویسوں، خطیبوں اور قصہ گویوں نے واقعات کو ان کے حق میں کس حد تک توڑا مروڑا اور یوں بیان کیا جیسے وہ خود چاہتے تھے۔ یہ جعلسازی اور ریاکاری آدھی صدی سے زیادہ عرصے تک جاری رہی، حتیٰ کہ شیعیان علیؑ کی تحریک کی نوبت آ گئی اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں اس تحریک کی قیادت بنو عباس نے سنبھالی۔ ظاہر ہے اس تحریک کی ابتدا میں عباسی شیعوں کے احساسات کو زیادہ سے زیادہ برانگیختہ کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے

کوشش کی کہ اپنے رقیبوں کے گھناؤنے چہرے کو زیادہ سے زیادہ بدنما بنا کر پیش کریں۔ عباسی حکومت کے وابستہ اشخاص میں بھی یقیناً ویسا ہی ایک گروہ شامل تھا۔ اس گروہ نے بھی ایسی روایتیں لکھیں اور پھیلائیں جو حقائق بیان کرنے سے زیادہ بنی عباس کے بچے کھچے دشمنوں کا خاتمہ کرنے کے لیے کارگر ہتھیاروں کا کام دیتی تھیں لیکن ان سب چیزوں سے بدتر وہ کوشش ہے جو عباسی حکومت کے دوسرے مرحلے میں یعنی ان کی حکومت کے قیام کے بعد اور اسناد کی تدوین سے پہلے عمل میں آئی۔ بنو عباس نے پہلے تشیع اور خاندانِ رسولؐ کی حمایت کو اپنی کامیابی کا ذریعہ بنایا' لیکن جب وہ برسرِ اقتدار آ گئے تو انہوں نے امام علیؑ کے خاندان پر بنی امیہ کے مقابلے میں کچھ کم ظلم نہیں ڈھائے۔ اگر ہم اس بات کو مدنظر رکھیں کہ اس زمانے میں تبلیغ کا ذریعہ حدیث تھی تو پتا چلے گا کہ ایک دفعہ پھر جعلسازی، تحریف اور سرقہ کا بازار گرم ہو گیا۔ اس طرح قدرتی طور پر ان داستانوں میں دوبارہ تغیر و تبدل کیا گیا جو ان نئے حاکموں کے مفادات سے سازگار نہیں تھیں۔ پس فقط خدائے تعالیٰ ہی جانتا ہے اور وہ لوگ جانتے ہیں جو ان واقعات کے عینی شاہد تھے کہ حقیقت کیا تھی اور میدانِ کربلا میں کیا گزری۔

علاوہ ازیں جو اسناد گیارہ سو سال پہلے سے ہمارے پاس موجود ہیں، ان کا ہر طبقہ خارجی حقیقت بیان کرنے سے زیادہ گروہی میلانات کو دہراتا ہے جو اسے ورثے میں ملے ہیں۔ مثلاً کچھ روایات اتنی مختصر ہیں کہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کوفہ کی فوج کے ہراول دستے سے قافلے کا آمنا سامنا ہونے سے جنگ کے خاتمہ تک ایک دو دن سے زیادہ عرصہ نہیں

گزرا اور جنگ بھی چند لحظوں سے زیادہ نہیں ہوئی، جبکہ کوفی روایات میں جہاں تک ہو سکا ہے تفاصیل بیان کرنے سے دریغ نہیں کیا گیا۔ افسوس ہے کہ جن اسناد سے دو قدیم تاریخ نویسوں یعنی یعقوبی اور طبری نے اس واقعہ کو نقل کیا ہے وہ ہمیں میسر نہیں ہیں اور آج تک ان کے جو نسخے باقی رہ گئے ہیں اور ہمارے پاس موجود ہیں، ان کی اصالت مشکوک ہے۔ لہٰذا آج کے بعد ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ ہم ان روایات کی تطبیق خارجی قرائن سے کریں۔

چونکہ تمام روایات میں حر بن یزید کا ذکر آیا ہے اور کہا گیا ہے کہ وہ پہلا شخص تھا جس سے قافلے کا آمنا سامنا ہوا لہٰذا اس داستان کو بھی قرینے کے ساتھ قبول کیا جا سکتا ہے کہ حر اس قافلے کو سیدھا کربلا نہیں لے گیا کیونکہ اسے اس بارے میں کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا۔ اسے صرف یہ کام سونپا گیا تھا کہ جہاں کہیں امام حسینؑ کو دیکھے ان کا راستہ روکے۔ لہٰذا یہ جو کوفی روایات میں لکھا گیا ہے کہ امام حسینؑ نے پہلے اس سے اپنے سفر کے بارے میں گفتگو کی اور فرمایا: "میں عراق کے لوگوں کی دعوت پر آیا ہوں اور اگر اب وہ اپنی اس دعوت سے پھر گئے ہیں تو میں واپس چلا جاتا ہوں"۔ حُر نے کہا: مجھے اس دعوت اور ان خطوں کا کوئی علم نہیں ہے۔ یہ روایت ان روایات سے صحیح تر معلوم ہوتی ہے جن میں کہا گیا ہے کہ امام حسینؑ سے ملاقات کے بعد حُر انہیں سیدھا عمرو بن سعد کے پاس لے گیا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ عمرو جنگ پر آمادہ ہے تو اپنے کیے پر پشیمان ہوا اور امام حسینؑ کے ساتھیوں میں شامل ہو گیا۔

روایات کے ایک اور سلسلے میں کہا گیا ہے کہ ابتدائی بات چیت

کے بعد امام حسین علیہ السلام نے حجاز واپس جانے کا ارادہ کیا، لیکن حرؒ نے اس کی اجازت نہیں دی۔ داستان کا یہ حصہ بھی مشکوک ہے، کیونکہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، امام حسین علیہ السلام جانتے تھے کہ وہ حجاز میں بھی یزید کے کارندوں کے ہاتھوں خطرے سے محفوظ نہیں ہیں اور یہی وجہ تھی کہ وہ اعمال حج بجالائے بغیر عراق روانہ ہو گئے۔ اس صورت میں یہ کیونکر ممکن تھا کہ عراق کے لوگوں سے نا امید ہو کر وہ دوبارہ حجاز چلے آتے؟ جو چیز صحیح معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ امام علیہ السلام چاہتے تھے کہ جتنی جلد ہو سکے کوفہ پہنچ جائیں۔ کیونکہ ان کے وہاں پہنچنے کے بعد ممکن تھا کہ نئے سرے سے فوج جمع کی جاسکتی لیکن حرؒ نہیں مانا اور اس نے انہیں روکے رکھا تاکہ اس بارے میں ابن زیاد سے احکام حاصل کر سکے۔

آخر کار دونوں گروہ اس بات پر متفق ہو گئے کہ ابن زیاد کا خط آنے تک ایک ایسے راستے پر چلتے رہیں جو نہ کوفہ کو جاتا ہو اور نہ حجاز کو جاتا ہو۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ جب وہ اس سرزمین میں پہنچے جسے آجکل کربلا کہا جاتا ہے، وہاں حرؒ کو ابن زیاد کا خط ملا، جس میں لکھا تھا کہ جہاں تمہیں یہ خط ملے حسینؑ کو وہیں روک لو۔ اس خط میں حرؒ کو تاکید کی گئی تھی کہ وہ امام حسین علیہ السلام کو ایک ایسی خشک زمین پر اتارے جہاں پانی نایاب ہو ـــــ اور پھر نئے احکام کا منتظر رہے۔

کربلا میں مقابل لشکروں کی تعداد

اَمُحِّصُوا بِالْبَلَاءِ قَلَّ الدَّیَّانُوْنَ

جب وہ آزمائے جائیں گے تو دیندار کم ہوں گے۔

(حسینؑ ابن علیؑ)

لفظ "کربلا" کے اشتقاق کی جو صورتیں لکھی گئی ہیں، شاید ان میں حقیقت سے زیادہ نزدیک یہ ہے کہ لفظ 'کربل' آرامی زبان کے دو الفاظ یعنی 'کرب' اور 'ال' (خدا) سے مل کر بنا ہے۔ اس صورت میں اس کے معنی "خدا کی کھیتی" کے ہوتے ہیں۔

بہرحال اس اشتقاق کا تعلق سانحۂ کربلا سے صدیوں پہلے کے زمانے سے ہے اور جب سے اس سرزمین پر یہ دردناک حادثہ وقوع پذیر ہوا ہے لفظ "کربلا" اپنے عربی معنی کرب (اندوہ) اور بلاء (آزمائش) سے زیادہ نزدیک ہوگیا ہے، یعنی دکھ اور مصیبت کا مقام! پتہ چلتا ہے کہ امام حسین علیہ السلام نے پوچھا: اس سرزمین کا کیا نام ہے؟ انہیں بتایا گیا کہ

اس کا نام کربلا ہے۔ تب آپ نے فرمایا: "اے خدا! میں کرب اور بلا سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ جس دن یہ قافلہ اس سرزمین میں اترا اس دن سے کربلا نے اسلام اور تشیع کی تاریخ میں اتنی شہرت پائی کہ کہا جا سکتا ہے مکہ کے بعد کسی اور شہر نے اتنی شہرت نہیں پائی۔

جس دن سے امام حسین علیہ السلام کے مزار نے زیارتگاہ کی شکل اختیار کی ہے، تب سے اب تک آپ کو ایسا کوئی شیعہ نہیں ملے گا جس کا دل اس مزار کے گرد چکر لگانے کی آرزو میں نہ تڑپتا ہو۔ اس زیارتگاہ کے بننے سے پہلے بھی شیعہ اپنے راستے میں تمام خطرات کے احساس کے باوجود کوشش کرتے تھے کہ اس خاک پر اپنے آنسوؤں کے قطرے بہائیں اور یہ ہدیہ پیش کر کے اس شہید کے ساتھ جو وہاں محوِ خواب ہے اپنی دوستی کا پیمان استوار کریں۔ بہت سے لوگ ایسے تھے جو خوف و ہراس کے باوجود مال خرچ کر کے اور جان ہتھیلی پر رکھ کر کوشش کرتے تھے کہ اس مزار تک پہنچیں۔ بہت سی ایسی عورتیں اور مرد گزرے ہیں جو اس سرزمین تک پہنچتے پہنچتے فوت ہو گئے اور اس خاک پاک کی زیارت کرنے کی آرزو اپنے دلوں میں لے کر دوسری دنیا میں پہنچ گئے۔ اس آستانے کو آباد کرنے کے لیے بے انتہا دولت اور اراضی وقف کی گئی ہے اور کی جا رہی ہے۔ پھر مذہبی ادب میں آپ کو ایسے قطعے، نظمیں اور قصیدے بہت کم ملیں گے جن میں کربلا اور وہاں مدفون شہیدوں کے ناموں کا ذکر نہ آیا ہو۔ فقط یہی نہیں کہ کربلا امام حسینؑ کا مزار اپنی گود میں لیے ہوئے ہے بلکہ یہ حق و باطل کی کشمکش اور ظلم و عدالت کے مابین جنگ کی سرزمین ہے۔ یہ اُن آزاد مردوں کی خوابگاہ ہے جنہوں نے موت کو ذلت پر ترجیح دی اور عزت و آبرو کے ساتھ مرنے کو ظالموں کیساتھ جینے سے

بہتر سمجھا۔ اس واقعہ کے کئی سال بعد ایک ایسے شخص سے جو ابن سعد کے لشکر میں شامل تھا یہ سوال کیا گیا: "تم نے یہ کیسی کالک اپنے منہ پر مل لی؟ تم نے یوں بزدلانہ طور پر رسول اکرمؐ کے فرزند اور ان کے ساتھیوں کا خون کیوں بہایا؟" اس نے جواب دیا: "خاموش رہو، ہوا یہ تھا کہ کچھ اشخاص ہمارے سامنے ڈٹ گئے۔ ان کے ہاتھ تلواروں کے قبضوں پر تھے اور قدم مضبوطی سے جمے ہوئے تھے۔ نہ وہ امان قبول کرتے تھے اور نہ ہی انہیں دولت کی ہوس تھی۔ ان کے سامنے فقط دو راستے تھے: ہمیں قتل کرنا اور حکومت پر قبضہ کرنا یا خود قتل ہو جانا، تمہاری ماں تمہیں روئے جو کچھ ہم نے کیا اس کے علاوہ ہمارے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔"

اس مختصر سی گفتگو سے پتا چل جاتا ہے کہ کربلا میں کیا ہوا اور کیسے ہوا۔ یہ صورت حال اور شہیدوں کے وہ اوصاف جو اس شخص نے بتائے ہیں، وہ ہمیں امام حسینؑ کے مختصر جملوں میں سے ایک جملہ کی یاد دلاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: "میں موت کو بجز خوش بختی کے اور ظالموں کے ساتھ زندگی گزارنے کو بجز رنج کے کچھ نہیں سمجھتا۔" جس رات امام حسینؑ نے اپنے ساتھیوں کو مسلم اور ہانی کے مارے جانے اور کوفیوں کی عہد خلافی کی خبر دی اور انہیں رکنے یا چلنے کا اختیار دیدیا، کئی ایک افراد چلے گئے اور فقط امام علیہ السلام کے رشتہ دار اور چند باایمان ساتھی باقی رہ گئے تھے۔ اس کے بعد بجز ایک دو اشخاص کے جو آخری دنوں میں آئے اور کوئی شخص اس گروہ کے ساتھ نہیں ملا اور یہ وہی دن تھے جب حر سے آپ کا سامنا ہوا۔ پھر کچھ اشخاص اس المناک حادثے کی رات کو بھی ابن سعد کو چھوڑ کر آپ کی لشکر گاہ میں آ گئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ سب ملا کر کتنے

آدمی تھے؟ تاریخ نویسوں نے جنگجوؤں کی تعداد سو سے زیادہ نہیں لکھی کسی نے ستر، کسی نے بہتر اور کسی نے پچھتر افراد لکھی ہے۔ دوسری جانب یہ بھی معلوم نہیں کہ عمر بن سعد کے ساتھ کتنے آدمی تھے۔ بعض مقتل نویسوں نے ان کی تعداد اسی ہزار اور ایک لاکھ تک لکھی ہے۔ مسعودی، طبری اور ان سے پہلے مؤرخین نے ابن سعد کے ساتھ آنے والوں کی تعداد چار ہزار لکھی ہے۔ ظاہر ہے کہ جہاں پہلے گروہ نے باریک بینی سے کام نہیں لیا وہاں دوسرے گروہ کے اعداد و شمار بھی غلط ہی ہیں۔ شیعی روایات میں کوفہ کے سپاہیوں کی کم از کم تعداد بیس ہزار لکھی گئی ہے [1] اور یہ تعداد چنداں مبالغہ آمیز نہیں ہے۔ جب کوئی لشکر ایسے مقصد کے لیے روانہ ہوتا ہے تو ابن الوقت لوگ ادھر اُدھر سے آکر اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ تاہم ابتدا میں جو لوگ ابن سعد کے لشکر میں شامل تھے، وہ ایک اندازے کے مطابق چھ سے آٹھ ہزار تک کی تعداد میں تھے اور ایک سو آدمیوں کا مقابلہ کرتے کے لیے یہ فوج کافی معلوم ہوتی ہے۔

---

[1] لہوف صفحہ ۵

عمرِ سعد سے امام حسینؑ کی گفتگو

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا
وَ ھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ

کیا لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ صرف اتنا کہہ دینے سے
کہ ہم ایمان لاتے ہیں، وہ چھوڑ دیے جائیں گے اور ان
کا امتحان نہ لیا جائے گا۔ (سورۂ عنکبوت۔ آیت ۲)

عمرو — جسے ابن زیاد نے امام حسینؑ کے خلاف جنگ لڑنے پر مامور کیا وہ سعد بن ابی وقاص کا بیٹا تھا۔ سعد — جنگِ قادسیہ کا فاتح اور ان دس اشخاص میں سے ایک تھا، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ رسول اکرمؐ اپنی رحلت کے وقت ان سے راضی تھے۔ ایرانی سپاہ کے ساتھ مسلمانوں کی جنگ کے موقع پر گو سعد بیمار تھا، لیکن اس نے جنگ کی رہنمائی کی۔ سریۂ عبیدۃ بن حرث میں اس نے قریش کی لشکر گاہ پر پہلا تیر پھینکا اور کہا جاتا

ہے کہ وہی پہلا تیر تھا جو اسلام میں دشمن کی لشکر گاہ پر پھینکا گیا[1] اس وقت سعد خدا کی خوشنودی، دین کی حمایت اور پیغمبر اسلامؐ کی نصرت کے لیے لڑ رہا تھا۔ لیکن ابھی اس واقعہ کو آدھی صدی بھی نہیں گزری کہ ہم دیکھتے ہیں اس کا بیٹا فرزندِ رسولؐ کو قتل کرنے کے لیے تیار ہو گیا ہے! اور جب حملہ کرنے لگتا ہے تو وہی جملہ دہراتا ہے جو بقول اس کے باپ نے جنگ قادسیہ میں کہا تھا یعنی: "اے لشکرِ خدا! سوار ہو جاؤ تمہیں فتح کی خوشخبری نصیب ہو"[2]

کیا سعد کے بیٹے کو معلوم نہیں تھا کہ کس کے خلاف لڑ رہا ہے اور کیوں لڑ رہا ہے؟ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا کیا وہ اس پر یقین بھی رکھتا تھا یا گستاخی کے اس درجے پر پہنچ گیا تھا کہ اسے یہ الفاظ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی تھی؟ یہ چیز کچھ بعید بھی نہیں۔ کیونکہ اس نے جو کچھ کیا وہ اس کی باتوں سے بھی بدتر تھا۔ یا کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ تاریخ نویسوں نے ایسے جملے بعد میں بڑھا دیے ہوں؟ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ صحیح صورت کیا ہے۔ لیکن ایک چیز مسلّم ہے اور وہ یہ کہ پہلی صدی ہجری کے دوسرے حصے کا معاشرہ اس قدر گر چکا تھا کہ ان لوگوں کو اس قسم کے اقوال اور افعال نہ صرف یہ کہ کسی طور بھی برے نظر نہیں آتے تھے بلکہ ایک حد تک فطری معلوم ہوتے تھے۔ قوم کے سردار ایک چیز چاہتے تھے اور وہ حکومت تھی۔ ان کے ماتحت لوگ بھی ایک ہی چیز چاہتے تھے اور وہ ان حاکموں کی خوشنودی تھی۔ عمرو بن سعد یہ ماموریت قبول کرنے سے انکار کر سکتا تھا۔ اگر وہ انکار کر دیتا تو عبیداللہ کو اس سے کوئی سروکار نہ ہوتا۔ کیونکہ بیسیوں اور ایسے اشخاص موجود تھے جو یہ ذمہ داری

---

[1] ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۲۲۴ [2] تاریخ طبری جلد ۷ صفحہ ۳۱۷

قبول کر لیتے۔ لیکن ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جن کے پاؤں امتحان کے وقت نہیں ڈگمگاتے۔ شاید یہ لوگ شروع شروع میں یہ نہیں سمجھتے تھے کہ نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی اور ان کا خیال تھا کہ کوشش کر کے معاملہ صلح صفائی کے ذریعے ختم کرادیں گے، تاہم یہ سوچ اپنے آپ کو دھوکا دینے کے مترادف تھی۔ عمرو بن سعد بھی حسینؑ کو اچھی طرح جانتا تھا اور اسے علم تھا کہ وہ حق اور ناحق کا ملا جلا تصفیہ کرنے والے نہیں ہیں۔

امام حسینؑ کے ساتھ اپنی پہلی گفتگو کے بعد عمرو بن سعد نے ابن زیاد کو ایک خط بھیجا جس میں لکھا: خدا کا شکر ہے کہ فتنہ دب گیا ہے اور جنگ کی نوبت نہیں آئی۔ امام حسینؑ ان تین میں سے کوئی ایک صورت قبول کرنے کو تیار ہیں:

(۱) مکہ چلے جائیں اور دوسرے مسلمانوں کی طرح زندگی بسر کریں۔

(۲) حجاز اور عراق کے علاوہ کسی اور سرزمین میں چلے جائیں۔

(۳) شام جائیں اور یزید کی بیعت کر لیں۔

بلاشبہ اس پیشکش کی تیسری شق درست نہیں ہے بلکہ ابن سعد نے جنگ کو ٹالنے اور اپنی ماموریت سے سبکدوش ہونے کے لیے اس کا اضافہ کیا ہے۔ تاہم جو کچھ طبری نے اپنی ایک روایت میں لکھا ہے وہ زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ امام حسین علیہ السلام سے مذاکرات کے بعد عمرو بن سعد نے ابن زیاد کو لکھا: "میں نے امام حسینؑ سے پوچھا کہ آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ اس شہر کے لوگوں نے مجھے دعوت دی تھی کہ میں ان کے پاس آؤں۔ اب اگر تم

لوگ نہیں چاہتے تو میں واپس چلا جاتا ہوں۔" [1]

ابن زیاد نے کہا: "اب جب کہ ہم نے اپنے پنجے اس پر گاڑ دیے ہیں، وہ اپنے آپ کو رہا کرانا چاہتا ہے، لیکن یہ ممکن نہیں۔"

پھر اس خط کے جواب میں اس نے لکھا: حسینؑ کے لیے مشکل حالات پیدا کر دو اور اس پر اور اس کے ساتھیوں پر پانی بند کر دو سوائے اس صورت کے جبکہ وہ یزید کے نام سے میرے ہاتھ پر بیعت کر لیں۔

---

[1] تاریخ طبری۔ جلد ۷ صفحہ ۳۱۱۔

کربلا میں امام حسینؑ کے خطبے

خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِہِمْ وَعَلٰی سَمْعِہِمْ

خدا نے ان کے دلوں اور آنکھوں پر مہر لگا دی ہے۔

(سورۂ بقرہ۔ آیت ۷)

معلوم نہیں کہ ابتدا میں یہ تمام سخت گیری اور بعد میں جنگ کے منصوبے کی تیاری اور اس پر اتنی بے رحمی سے عملدرآمد دمشق کے اشارے پر تھا یا یہ اقدام خود حاکمِ کوفہ نے کیا تھا۔ شاید آقا اور اس کا کارندہ دونوں ہی آپس میں شریک تھے، تاہم میدانِ جنگ، لوگوں کے ہجوم اور کوفہ و دمشق کے محلات میں جو گفت و شنید ہوئی اس سے ایک نکتے کا پتا چلتا ہے اور وہ یہ کہ شروع شروع میں کوفہ کے لوگ یہ نہیں جانتے تھے کہ اس حادثے کا انجام اتنا دردناک ہوگا اور شاید وہ چاہتے بھی نہیں تھے کہ ایسا ہو۔

فوج کے بہت سے افسر خود ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے

امام حسینؑ کو خط لکھے تھے اور کوفہ آنے کی دعوت دی تھی۔ ابتدا میں وہ ایسی جنگ نہیں چاہتے تھے اور شاید انہیں گمان نہیں تھا کہ نوبت جنگ تک پہنچے گی۔ ابن سعد جو سپہ سالار تھا ایک طرف تو نام ونمود اور رے کی حکومت کا خواہشمند تھا، دوسری طرف بدنامی سے بھی ڈرتا تھا اور امام حسینؑ کے خون سے ہاتھ نہیں رنگنا چاہتا تھا۔ کیا وہ خدا سے ڈرتا تھا؟ جب تک اس نے یہ ذمہ داری قبول نہیں کی تھی، اس وقت تک تو اس چیز کا احتمال ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے بعد وہ خدا کے غضب سے نہیں بلکہ لوگوں کی لعنت ملامت سے خوفزدہ تھا۔ بہت سے مسلمان اتنے بڑے گناہ سے چشم پوشی نہیں کرتے کہ رسول اکرمؐ کے ایک صحابی کا بیٹا آنحضرتؐ کے فرزند کو قتل کردے، اگرچہ یہ معلوم نہیں کہ اگر امام حسینؑ کا مقابلہ کرنے کی یہی ذمہ داری ابن سعد وغیرہ کو سرزنش کرنے والوں کے سپرد کی جاتی تو ان میں کتنے اسے قبول کرنے سے انکار کردیتے۔ بہرحال جب جنگ کے تنور کی گرمی زائل ہو جاتی اور ہر کوئی اپنے کام کاج سے لگ جاتا تو وہ پیغمبرؐ کی امت کے ساتھ کیسے زندگی گزارتا؟ یہ چیز تھی جس کے بارے میں عمرو پریشان تھا اور چند اشعار بھی اس سے منسوب کیے گئے ہیں جن سے اس کے تذبذب کا پتا چلتا ہے۔ نیز جیسا کہ تاریخوں میں لکھا گیا ہے، اس کے کچھ دوست احباب نے بھی ہمدردی کی بنا پر یا کسی اور وجہ سے اسے اس برے فعل کے ارتکاب سے خبردار کیا۔ اس کے بیشتر فوجی سرداروں کی حالت بھی اس سے بہتر نہ تھی۔ تاہم ان کے درمیان چند کم ظرف طالع آزما بھی تھے جو کسی بات سے نہیں ڈرتے تھے۔ یہ وہی لوگ تھے جو ایک کے بعد دوسرا رنگ بدلتے ہیں، وہی جو ہر معاملے میں اپنا ذاتی فائدہ تلاش کرتے ہیں اور وہی جو بعض اوقات

کے لیے تیار تھے۔ ایسے حالات میں قرآن مجید کا حکم یہ ہے کہ:

"اگر مومنوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو کوشش کرو کہ ان میں صلح صفائی ہو جائے۔ اگر ان دو گروہوں میں سے ایک زیادتی پر تل جائے تو اس کے خلاف جنگ کرو حتیٰ کہ وہ حکم کے آگے گردن جھکا دے۔"

پس امام علیہ السلام اور ان کے ساتھی ہر دوسرے مسلمان کے مقابلے میں اپنے آپ کو قرآن مجید کی پیروی کرنے کا زیادہ ذمہ دار سمجھتے تھے۔ ان کے لیے ضروری تھا کہ جہاں تک ممکن ہو کوشش کریں کہ ان گمراہوں کو ان کی غلطی کا احساس دلائیں۔ ان میں سے ایک بزرگ جنہوں نے اس بارے میں خیر خواہی میں کوئی کوتاہی نہیں کی زہیر بن قین تھے وہ کوفہ کی فوج کے سامنے جا کھڑے ہوتے اور فرمایا: "اے لوگو! دوسرے مسلمان کی بھلائی چاہنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ جب تک تلواریں نہیں کھنچتیں ہم ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ ایک دین رکھتے ہیں۔ لیکن جب تلواریں نیاموں سے نکل آئیں گی اور جنگ چھڑ جائے گی، اس وقت ہمارا یہ تعلق باقی نہ رہے گا۔"

یہ اور ایسی ہی دوسری تقریریں اور گفتگوئیں جو امام حسینؑ کے بعض اصحاب اور کوفہ کے یزیدی لشکریوں کے درمیان ہوئیں، وہ لفظی تفاوت کے باوجود حقیقت کو ظاہر کرتی ہیں۔ یہ باتیں حدیث اور روایت کی طرح نہیں ہیں جو کسی خاص غرض کے تحت کہی گئی ہوں۔ بلکہ ان کے انداز سے پتا چلتا ہے گویا کہ کوئی محتاط صحافی موقع پر موجود تھا اور اس نے جو کچھ ہوتا ہوا دیکھا وہ لکھ لیا۔ جہاں تک ہو سکا امام حسین علیہ السلام

اپنا فائدہ بھی نہیں چاہتے اور فقط دوسروں کا نقصان کر کے لطف اٹھاتے ہیں۔ یہ وہی لوگ تھے جن کی خوشی اس بات میں ہوتی ہے کہ کوئی خاندان، شہر یا معاشرہ چین سے نہ بیٹھے۔ چنانچہ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں امام علیؑ نے یہ الفاظ فرمائے تھے: "ناخوش رہیں وہ لوگ جن کا چہرہ کہیں نہیں دیکھا جا سکتا بجز ایسی جگہ کے جہاں شر ہو"

یہ وہ لوگ تھے جن کے ہاتھوں امام علی علیہ السلام نالاں تھے اور جن کے شر کے نتیجے میں امام حسنؑ گوشہ نشین ہو گئے۔ یہ شبث بن ربعی، شمر بن ذی الجوشن اور ایک دو دوسرے کمینہ اشخاص تھے جو چاہتے تھے کہ جتنی جلدی ممکن ہو وہ اپنا یہ کام برے سے برے طریقے کے ساتھ انجام دیں، لیکن جو لوگ کچھ دور اندیش تھے وہ اتنی جلدی میں نہیں تھے۔ یہی وجہ ہوئی کہ جنگ کے آغاز میں کچھ تاخیر ہو گئی۔ امام علیہ السلام بھی نہیں چاہتے تھے کہ نوبت جنگ تک پہنچے۔ جب حرؑ سے آمنا سامنا ہوا تو ان کے ایک ساتھی نے کہا: "بہتر ہو گا کہ ہم اس رکاوٹ کو راستے سے ہٹا دیں۔ ورنہ ہمیں زیادہ سخت رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

اگر امامؑ جنگ کے خواہاں ہوتے تو اس کا مشورہ قبول کر لیتے لیکن انہوں نے اس کے جواب میں بطور ہدایت فرمایا: "موجودہ حالات میں میرا فریضہ جنگ نہیں ہے۔"

لہٰذا مؤرخین کا یہ لکھنا درست معلوم ہوتا ہے کہ "امام علیہ السلام کے چند ساتھیوں سے جہاں تک ہو سکا انہوں نے خیر خواہی کے طور پر کوفہ کے سپاہیوں کو نصیحت کی اور وہ جس فعل کے درپے تھے انہیں اس کی برائی سے آگاہ کیا۔" وہ دونوں مسلمان تھے اور ایک دوسرے کے خلاف لڑنے

نے بھی کوشش کی کہ اپنی ان باتوں سے جو سراسر خیر خواہی اور ہمدردی پر مبنی اور حقیقت کو واضح کرنے والی تھیں، ان لوگوں کے ضمیر کو بیدار کریں جنھوں نے دنیا کی خاطر اپنا دین بیچ ڈالا تھا۔ آپ نے انہیں بتایا کہ یہ آخری موقع ہے جو انہیں مل رہا ہے تاکہ وہ اپنے لیے آزادانہ زندگی کا سامان کر لیں۔ اگر انہوں نے یہ موقع کھو دیا تو پھر وہ کبھی بھی جبر و تشدد سے نجات حاصل نہ کر سکیں گے۔ اگر انہوں نے عزت حاصل کرنے کی اس دعوت کو ٹھکرا دیا تو اس کے بعد ذلت کی زندگی ان کا انتظار کر رہی ہے۔ یہی وجہ ہوئی کہ دسویں محرم کے دن کا ابتدائی حصہ پیغام آنے جانے، کچھ کہنے سننے اور تقریریں کرنے میں گزرا۔ ان حساس اور پر اضطراب لمحوں میں امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کی جانب سے کچھ مختصر تقریریں کی گئیں۔ یہ تقاریر جنہیں تاریخ نے خوش قسمتی سے ضبط کر لیا ہے، اس سانحہ کی بڑی قیمتی اسناد ہیں۔ ان میں آزادی، شرافت اور پرہیزگاری کی روح سے بھی بڑھ کر گمراہ لوگوں کے لیے شفقت و ہمدردی اور ان کی نجات کے لیے انسانی کوشش کے نقطۂ عروج کا پتا چلتا ہے۔ امام حسین علیہ السلام نے ان پر اضطراب گھڑیوں میں جو خطبے دیے ان میں سے ایک کا ترجمہ درج ذیل ہے:

"اے لوگو! جلدی نہ کرو، میری بات سنو کہ میں تمہاری بھلائی چاہتا ہوں۔ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں تمہاری سرزمین میں کیوں آیا ہوں۔ اگر تم نے میری بات سنی، انصاف سے کام لیا اور دیکھا کہ میں درست کہہ رہا ہوں تو یہ جنگ جو کسی وقت بھی چھڑ سکتی ہے، اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ لیکن اگر تم نے میری بات نہ سنی اور انصاف کی راہ پر نہ چلے تو اس کا نقصان تمہیں ہی پہنچے گا۔

اے لوگو! کیا تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں؟ کیا مجھے قتل کرنا تمہارے لیے جائز ہے؟ کیا یہ روا ہے کہ تم میری حرمت کو ضائع کردو؟ کیا میں تمہارے پیغمبرؐ کی بیٹی کا فرزند نہیں ہوں؟ کیا میرے والد پیغمبرؐ کے وصی، چچازاد بھائی اور پہلے مسلمان نہیں ہیں؟ کیا تم نے یہ حدیث سن رکھی ہے کہ رسول اکرمؐ نے میرے اور میرے بھائی کے متعلق فرمایا: میرے یہ دو فرزند اہل بہشت کے جوانوں کے سردار ہیں۔ اگر تم میری ان باتوں کو سچ سمجھتے ہو تو بہت بہتر ہے۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا جھوٹ نہیں بولا ہے۔ ہاں اگر تم سمجھتے ہو کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں تو تم رسول اکرمؐ کے ان اصحاب سے پوچھ سکتے ہو جو ابھی زندہ ہیں۔ جابر بن عبداللہ انصاری، ابوسعید خدری، سہل ساعدی، زید بن ارقم اور انس بن مالک تمہیں بتائیں گے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ درست ہے۔ اے لوگو! تم کس شرعی جواز کی بنا پر میرا خون بہانا چاہتے ہو؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ امام علیہ السلام نے یہ باتیں دشمن کے چنگل سے رہائی پانے کے لیے یا مارے جانے کے خوف سے نہیں کہی تھیں۔ اگر وہ ان سے کوئی بھی چیز چاہتے تو اس کا حصول چند دن پہلے زیادہ بہتر طور پر ممکن تھا۔ یہ تقریر جس سے ہر اس شخص کو جس کی قوت شامہ درست ہو ـــــــ صلح جوئی، خیر خواہی اور انسان دوستی کی خوشبو آتی ہے۔ یہ ان تقاریر کا ایک نمونہ ہے جو ایسے حالات میں ساری تاریخ انسانی میں فقط چند اشخاص نے ہی کی ہیں۔ یہ خدا کے ایک برگزیدہ بندے کی باتیں ہیں، یہ اس شخص کی باتیں ہیں جو اپنے آپ کو سوتے ہوئے ضمیروں کو جگانے پر مامور سمجھتا ہے۔ وہ شخص جو غصے کے ان شعلوں اور نفسانیت کی اس

طغیانی میں چھلانگ لگا دیتا ہے جس میں جاہل لوگ جا گرے ہوں، وہ کوشش کرتا ہے کہ ایک دو اشخاص کو بچا لے اور ان طوفانوں سے باہر نکال لائے۔

آپ یہ خطبہ دوبارہ پڑھیں کہ جس میں کسی لفظی آرائش یا ندرت بیان کی رعایت نہیں کی گئی اور مقرر نے اس میں منطقی دلائل کا سہارا نہیں لیا۔ یہ ایک بے حد سیدھا سادا بیان ہے جس کے معنی سب لوگ بخوبی سمجھتے تھے لیکن اپنے آپ کو ان سے بے خبر ظاہر کرتے تھے۔ یہ ایک ایسی تقریر ہے کہ ان لوگوں میں سب سے زیادہ سادہ لوح شخص بھی بخوبی اس کی گہرائی تک پہنچ سکتا تھا۔

جیسا کہ امامؑ نے فرمایا:

> "اے لوگو! میں تمہارا خیر خواہ ہوں اور پھوٹ ڈالنے کے لیے نہیں آیا۔ تم سب مجھے پہچانتے ہو اور جانتے ہو کہ میں جھوٹ نہیں بولتا۔ تم مجھے کیوں قتل کرنا چاہتے ہو؟ تمہیں یہ حق کس نے دیا ہے؟"

یہی وہ موقع تھا جب فتنہ و فساد اور جنگ و جدل کے خواہش مند لوگوں کو خوف پیدا ہوا کہ یہ الفاظ جو سراسر خیر خواہی پر مبنی تھے، لوگوں کے پتھر دلوں کو پگھلا کر نہ رکھ دیں۔ وہ ڈر گئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے سب سپاہی یا ان کی کچھ تعداد امام علیہ السلام کی باتوں سے متاثر ہو جائے۔ چونکہ ان لوگوں کا مقصد فتنہ فساد پھیلانا تھا اور اگر ایسا ہو جاتا تو وہ اپنا مقصد حاصل نہ کر پاتے۔ چنانچہ ایک رذیل اور خون حسینؑ کے پیاسے نے بہ آواز بلند کہا:

"تم جو کچھ کہہ رہے ہو اگر میں وہ سمجھ پایا ہوں تو میں نے خدا کی غلط پرستش کی ہے"۔ یہ بات ایک ایسے شخص نے کہی جس نے اپنی ساری

زندگی میں کبھی بھی سچ مچ یا جھوٹ موٹ خدا کی پرستش نہیں کی تھی۔ کیونکہ اس کا خدا سے ہرگز کوئی واسطہ ہی نہ تھا اور اس دن سے جب اس نے کوفہ میں اپنے آپ کو امام علیؑ سے وابستہ کیا، اس دن تک جب وہ انہی کے بیٹے کا کام تمام کرنے کا منتظر تھا، ہم اس شخص کی زندگانی سے اچھی طرح واقف ہیں اور وہ شمر بن ذی الجوشن تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو آزاد مردوں کو دکھ دیکر لذت محسوس کرتے ہیں اور انہیں خوشی اس وقت ہوتی ہے جب وہ اپنے ہاتھوں سے پرہیز گار اور شریف اشخاص کی زندگی کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ افسوس ہے کہ تاریخ میں ایسے لوگوں کی تعداد کچھ کم نہیں ہے۔

آخر کار وہ ہوگیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یا جو کچھ ان حالات میں ہونا چاہیے تھا اس کا آغاز ہوگیا۔ ایک ایسی صورت پیدا ہوگئی جس کی خبر قرآن مجید نے نصف صدی پہلے دی تھی: "اگر محمدؐ فوت ہو جائیں یا قتل ہو جائیں تو کیا تم اپنے ماضی کی طرف لوٹ جاؤ گے؟ جو کوئی ایسا کرے گا تو خدا کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔" (سورۂ آل عمران۔ آیت ۱۴۴)

یہ لوگ پچاس سال کے بعد اپنی پرانی خصلتوں کی جانب لوٹ گئے، جس کی طرف غصے اور نفسانی خواہشات کے سوا کوئی چیز رہنمائی نہیں کرتی تھی۔ قرآن، حدیث اور جلیل القدر صحابہ کی سیرت اور سچے مسلمانوں کے طور طریقے جو پچاس سال سے مشعل راہ تھے وہ چند گھڑیوں میں الگ رکھ دیے گئے۔ وہ وحشیانہ فطرت جسے ان دینی پابندیوں نے محدود اور محصور کر رکھا تھا وہ پھر سے آزاد ہو گئی۔ یہ فطرت تھی جس کا نہ صرف یہ کہ اسلامی عادات و اطوار سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ اس کے اور انسانی فطرت کے درمیان بھی بڑا طویل فاصلہ نظر آتا تھا۔

محاربۂ کربلا

كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْقَتْلَ فَبَرَزُوْا اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ

خدا نے قتل ہونا ان کے لیے مقدر فرما دیا تھا لہٰذا وہ اپنی قتل گاہ کی جانب چلے گئے۔ (زینبؑ بنتِ علیؑ)

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں تاریخی اسناد میں دو صدیوں تک کی تحریف کے باعث ان میں سے خارجی حقائق کو ڈھونڈ نکالنا اور وہ بھی ایک ایسے حادثے کے بارے میں کہ جس سے مخالف گروہوں کا مفاد وابستہ ہو، ایک مشکل کام ہے لیکن خوش قسمتی سے کچھ وقائع نویس میدان جنگ میں موجود تھے۔ جو کچھ وہاں ہوا وہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا یا وہ حادثہ کے مقام کے نزدیک تھے اور انہوں نے واقعات کے بارے میں دوسرے راویوں سے سنا۔ لہٰذا جب چند وقائع نویس کسی حادثے کے بارے میں ایک جیسی باتیں کہیں تو ان کے اس بیان کے جعلی ہونے کا احتمال نہیں رہتا یا کم ہو جاتا ہے۔

علاوہ ازیں جس چیز کی خارجی قرائن بھی تائید کریں، اس کا قبول کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ جب ہم ان تمام داستانوں کو جو ایک دوسری کی ضد اور نقیض ہیں جمع کرتے ہیں اور ان کی مطابقت خارجی قرائن سے کرتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ فریقین کی لڑائی نے اتنا طول نہیں کھینچا کہ اس کے لیے بہتّر گھنٹوں کا وقت درکار ہو۔ تاہم یہ مدت اتنی کم بھی نہیں تھی جتنی دنیا کے بدلے دین فروخت کرنے والے خوشامدی شخص (زحر بن قیس) نے یزید کے سامنے بیان کی۔

جب زحر بن قیس یزید کے دربار میں پہنچا تو اس نے کہا:

"آپ کو فتح مبارک اور خدا کی مدد مبارک ہو! حسینؑ ابن علیؑ اپنے سترہ رشتہ داروں اور ساٹھ ساتھیوں کے ساتھ ہمارے پاس آئے۔ ہم نے ان سے کہا کہ اطاعت قبول کرو۔ انہوں نے جنگ کو ترجیح دی اور جونہی سورج کی کرنیں زمین پر پڑیں، ہم نے ان کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ تب وہ ایسے کبوتروں کی طرح جو باز کے پنجے سے بھاگ نکلتے ہیں، جائے پناہ کی تلاش میں ہر طرف دوڑتے پھرتے تھے۔

اے امیرالمومنین! خدا کی قسم اتنا وقت لگا جتنا ایک اونٹ ذبح کرنے میں لگتا ہے یا جتنا کوئی چاشت کے وقت سوتا ہے۔ ہم نے ان سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا، اب ان کے بدن برہنہ ہیں جنہیں خون نے ڈھانپ رکھا ہے اور ان کے چہرے خاک آلود ہیں۔ سورج ان کے بدن کو گلا رہا ہے اور ہوا ہر طرف سے ان پر گرد ڈال رہی ہے اور گدھوں کے علاوہ کوئی ان کے قریب نہیں جاتا۔" [1]

---

[1] تاریخ طبری جلد ۷ صفحہ ۳۷۴

اس رذیل اور جھوٹے شخص نے ایک ایسی مجلس میں اپنے امیر کو خوش کرنے کے لیے جو کچھ کہا اس کی یقیناً کوئی حقیقت نہیں اور وہ کہنے اور سننے والے کے لیے مضحکہ کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تکذیب کرتا ہے۔ وہ اس طرح کہ اس کے کہنے کے مطابق جو شخص اطاعت قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتا اور جنگ کو ذلت پر ترجیح دیتا ہے پھر وہ موت سے نہیں ڈرتا اور کبوتر کی طرح باز کے پنجے سے نہیں نکل بھاگتا۔ اس کی یہ بات اس قدر غیر حقیقی اور حیرت ناک تھی کہ یزید بھی ٹھٹک کر رہ گیا اور کہنے لگا: "خدا ابن مرجانہ (ابن زیاد) پر لعنت کرے کہ میں حسینؑ کے قتل پر راضی نہ تھا۔"

بہرحال یہ بات مسلم ہے کہ کربلا کی جنگ نہ تو اتنی سی دیر میں ختم ہوئی جس کا ذکر ابن قیس نے کیا اور نہ ہی وہ اتنی طول طویل تھی جیسے کہ بعض سادہ دل مقتل نویسوں نے لکھا ہے۔ گویا کہ جب انہوں نے اپنے تصور میں یہ شعر گوئی شروع کی تو انہیں قافیہ تنگ نظر آیا، اس لیے وہ مجبور ہوگئے کہ عاشورا کے دن کو "بہتر" گھنٹوں کا شمار کریں۔ تاکہ اس مدت میں ان کے حسب دلخواہ جنگ آزماؤں کے رجز پڑھنے، تقریریں کرنے، جنگ لڑنے اور دشمن کو قتل کرنے کے تمام مرحلے انجام پا جائیں۔ جبکہ اس معرکے میں دونوں طرف سے گنتی کے آدمی مارے گئے، ان میں سے بھی فقط ایک طرف والوں کی تعداد معلوم ہے۔ چنانچہ امام حسینؑ کے ہمراہیوں میں سے جن مردوں کی عمر چودہ سال سے متجاوز تھی وہ سب کے سب قتل کر دیے گئے۔ تاریخ کی بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ امام علیؑ ابن الحسینؑ چونکہ ابھی سن بلوغ کو نہیں پہنچے تھے

اس لیے انہیں چھوڑ دیا گیا۔[1]

لیکن جہاں تک کوفہ کی یزیدی فوج کا تعلق ہے، خدائے تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان میں سے کتنے مارے گئے۔ ان میں سے مارے جانے والوں کی کم از کم تعداد تہتر اور زیادہ سے زیادہ ہزاروں لکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ میدان کربلا میں جو عجیب بات نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ وہاں چند گھنٹوں میں دورِ جاہلیت کی سخت اور بے رحم ذہنیت اپنے تمام مظاہر کے ساتھ جلوہ گر ہو گئی۔ وہ عرب جو اپنے خیمے کے سائے میں بیٹھی ہوئی ٹڈیوں کا شکار کرنے والوں کے خلاف تیر کمان اٹھا لیتا تھا، عاشور کے دن اسی کا بیٹا رنگ بدلتا ہے اور بسوس، بکر اور تغلب وغیرہ دورِ جاہلیت کی جنگوں کی یاد زندہ کرتا ہے۔ اس کشمکش کے دوران ایک شخص امام حسینؑ کو آواز دیتا ہے اور کہتا ہے:

"حسینؑ! پانی کی اس موج کو دیکھتے ہو؟ خدا کی قسم! تم اس میں سے نہ پی سکو گے۔ حتیٰ کہ تم دوزخ کا جہنم جا پیو گے۔"

ایک اور بے حیا فرزند رسولؐ اور خاندانِ رسولؐ کو مخاطب کر کے کہتا ہے: "ہم پاکیزہ ہیں اور تم ناپاک ہو۔"

دوسری طرف اس وحشیانہ خونریزی کے بعد سپہ سالار حکم دیتا ہے کہ مقتولین کے بے جان جسموں پر گھوڑے دوڑائے جائیں۔ یہاں یہ یقین کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ آیا یہ اشخاص انہی لوگوں کی پہلی یا دوسری نسل ہیں جن میں سے ہر شخص پانی سے اپنا خشک حلق تر نہ کرتا، بلکہ اپنے مسلمان بھائی کو دیدیتا

---

[1] تاریخ طبری جلد ۷ صفحہ ۳۸۷

اور پھر وہ بھی یہی عمل کرتا، حتیٰ کہ وہ سبھی پیاس سے مرجاتے تھے۔ اسی طرح جب ان کے ہاں رات کے وقت کوئی مہمان آتا تو وہ اپنا کھانا اس کے آگے رکھ کر چراغ گل کر دیتے اور منہ ہلاتے رہتے تاکہ مہمان یہ سمجھے کہ میزبان بھی اس کے ساتھ کھانے میں شریک ہے۔ وہ اس لیے ایسا کرتے تھے کہ اگر وہ خود بھی کھانا کھانے میں شامل ہو جائیں تو ہوسکتا ہے مہمان سیر نہ ہونے پائے۔

شاید آپ میں سے بیشتر قارئین نے مصر کے سلسلے میں ابن عاص اور دو کبوتروں کا قصہ سن رکھا ہوگا کہ فتح مصر کے وقت عمرو بن العاص اس جگہ خیمہ زن ہوا جسے اب فسطاط کہتے ہیں۔ جب وہاں سے کوچ کرنے اور کسی دوسری جگہ جانے کا فیصلہ ہوا تو سپہ سالار کو بتایا گیا کہ ایک کبوتری نے تمہارے خیمے پر گھونسلہ بنا کر اس میں انڈے دے دیے ہیں۔ اگر خیمہ اکھاڑا گیا تو انڈے ٹوٹ جائیں گے اور نر و مادہ دونوں کبوتروں کو دکھ ہوگا۔ ابن عاص نے کہا کہ خیمہ اسی طرح گڑا رہے اور ایک سپاہی یہاں ٹھہرے۔ جب یہ کبوتر اپنے بچوں کو ساتھ لے کر اڑ جائیں تو وہ یہ خیمہ اکھاڑ کر لے آئے۔ [1]

ابھی اس واقعے کو چالیس سال سے زیادہ کا عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ہم دیکھتے ہیں، انہیں لوگوں کے فرزند اپنے پیغمبرؐ کی بیٹیوں کے خیموں کو آگ لگاتے ہیں۔ تاکہ امام حسینؑ کے کم سن بچوں اور رسول اکرمؐ کے پوتوں پوتیوں کو جلا دیں۔ ذرا دیکھیے کہ ان دونوں مناظر میں سے کونسا رقت انگیز ہے؟ کیا وجہ ہے کہ انسان اپنے بلند مقام سے اس حد تک نیچے آجاتا ہے اور پستی کے آخری نقطے پر پہنچ جاتا ہے؟ انسان کا دماغ بھی کتنی پیچیدہ

---

[1] معجم البلدان جلد ۵ صفحہ ۲۶۰

چیز ہے۔ کلامِ خداوندی سب سے بہتر طور پر اس معمے کی توجیہ کرتا ہے:

"شیطان ان پر مسلط ہو گیا اور اس نے ان کے دلوں سے خدا کی یاد زائل کر دی"۔ [1]

---

[1] سورۂ مجادلہ۔ آیت ۱۹

طرفین میں سے سچے مسلمان کون؟

لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ

ان کے لیے ان کے پروردگار کے یہاں بہشت ہے

(سورۂ انعام۔ آیت ۱۲۷)

ایک اونٹ کو ذبح کرنے میں پانچ گھنٹے یا دس گھنٹے یا بہتر گھنٹے، جتنا وقت لگا وہ بھی گزر گیا۔ وہ ایک لاکھ یا تیس ہزار یا اٹھارہ ہزار اشخاص جنہوں نے مختار ابن ابو عبیدہ کے گھر میں مسلم بن عقیل کے ہاتھ پر اپنی جانیں قربان کر دینے کی قسم کھا کر بیعت کی اور ان لوگوں میں سے جو عراق اور حجاز کے شہروں سے امام حسینؑ کے قافلے میں آملے تھے۔ یوم عاشور کو ان ہزاروں میں سے فقط بہتر افراد کے بدنوں کے ٹکڑے ہوئے اور وہ خون میں لتھڑے، اس وحشت ناک بیابان میں ادھر اُدھر بکھرے نظر آرہے تھے۔ یہ کون لوگ تھے؟ یہ سچے مسلمان تھے! یہ وہ مسلمان تھے جو امتحان کے میدان میں اترے اور بڑی

سخت آزمائش سے بخوبی عہدہ برآ ہوئے۔ وہ نہ صرف اس امتحان میں سرخرو ہو کر نکلے، بلکہ انہوں نے رہتی دنیا تک ایسی آزمائش میں شریک ہونے والے لوگوں کو بتلا دیا کہ اگر تم کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہو تو تمہیں پاکباز ہونا چاہیے۔ اس کے برعکس ان ہزاروں ڈھلمل اور ابن الوقت افراد کا معاملہ کیسا رہا جن کا ہمیں کوئی نام و نشان نہیں ملتا؟ ان سے میری مراد مسلم بن عقیل کے ہاتھ پر دوسرے بیعت کرنے والے لوگ ہیں۔ کیا وہ مسلمان نہ تھے؟ کیوں نہیں! وہ بھی مسلمان تھے لیکن وہ اسلام کے اس حد تک خواہاں تھے کہ ان کے مال اور جان کو نقصان نہ پہنچے۔ جونہی انہوں نے دیکھا کہ ایک مشکل امتحان درپیش ہے وہ اس میں شریک نہیں ہوتے بلکہ اپنے گھروں کو چلے گئے اور دروازے بند کر کے آرام سے بیٹھ رہے، تاکہ اپنے آپ کو ایک فتنہ برپا کرنے کے لیے تیار کریں۔ جب ایک مردمومن اٹھے، یہ اس کے گرد جمع ہو جائیں اور اس سے ساتھ دینے کا وعدہ کریں۔

ان میں سے ایک اور چھوٹے سے گروہ نے کچھ زیادہ ہی ایثار و قربانی کا اظہار کیا۔ انہوں نے ایسا کام کیا کہ جب تک یہ دنیا اور اس کی تاریخ باقی ہے، انسان، تاریخ اور حقیقت ان کا مذاق اڑاتی رہے گی۔ وہ عاشور کے دن ایک ٹیلے پر چڑھ گئے اور رومال آنکھوں پر رکھ کر رونے لگے اور کہنے لگے: "اے خدا! حسینؑ کی مدد کر!"

اس وقت دن کی آخری گھڑیاں ختم ہو رہی تھیں، جب وہ دیوانے کہ جن کے جسم اور روح اہل حق سے کینہ وری اور دنیا کی دولت اور عہدیداری کے لالچ سے پُر تھے، اپنے مدمقابل اشخاص کو قتل کر چکے، ان کے خیمے جلا چکے اور مال و اسباب لوٹ چکے تھے۔ جب عورتوں اور مردوں میں سے

پھر آپ نے ان کے حق میں یہ الفاظ کہے جن کے وہ سزاوار تھے:

"اے خدا! اپنی باران رحمت کو ان سے دُور رکھ، زمین کی برکتیں ان سے چھین لے، حکام ان سے ہرگز خوشنود نہ ہوں اور انہیں ہرگز ایک جماعت کی شکل اختیار کرنے کی توفیق نہ دے!" [1]

پھر ہوا یہ کہ ابھی چار سال سے زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ امامؑ کے ارشاد کے مطابق عذابِ الٰہی نے ان بزدلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ چنانچہ عراق میں شورش برپا ہو گئی اور ہر طرف قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا اور انتقام کی آگ کے شعلے بھڑکنے لگے۔ وہ آگ جس نے سب سے پہلے کربلا میں شہید ہونے والے مظلوموں کے قاتلوں کو نگل لیا اور اس سے پیشتر کہ وہ اگلی دنیا میں سزا بھگتیں، اس دنیا کی ذلّت میں گرفتار ہو گئے۔

وہ لوگ جو امام حسینؑ کی نصرت سے منہ موڑ کر اپنے گھروں کو چلے گئے تھے اور جنہوں نے جنگ میں حصہ نہیں لیا تھا ان کا کیا بنا؟ جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے وہ بھی سزا سے نہ بچ سکے لیکن سوال یہ ہے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ اس سلسلے میں ہم ایک دفعہ پھر سید الشہداء علیہ السلام کے وہ الفاظ دہراتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

"لوگ دنیا کے بندے ہیں اور وہ دین کو اس حد تک چاہتے ہیں کہ اس کے ساتھ اپنی زندگی سنواریں، لیکن جب آزمائش کا وقت آتا ہے تو دیندار بہت کم ہوتے ہیں"۔

---

[1] تاریخ طبری جلد ۷ صفحہ ۳۶۵

ان کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہ رہا تو وہ اچانک ہوش میں آگئے کہ انھوں نے برا کام کیا ہے۔ جن لوگوں کا صحیح منطق اور عقلِ سلیم میں کوئی حصہ نہیں ہوتا یا بہت کم ہوتا ہے، یہ ان کی فطرت کا دوسرا رُخ ہے۔ وہ جلدی طیش میں آ جاتے ہیں اور بہت جلدی پشیمان ہوتے ہیں۔ تب وہ پہلے دل ہی دل میں کہنے لگے کہ یہ ہم نے کیا کر دیا؟ پھر آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے کہنا شروع کیا کہ افسوس ہم نے بہت برا کام کیا ہے! یہ شخص تو ہمارا خیرخواہ تھا! ہم نے خود ہی اسے بلایا اور پھر نہ صرف یہ کہ اس کی کوئی مدد نہ کی بلکہ اسے اور اس کے ساتھیوں کو حکومتِ دمشق کے گماشتے کے سامنے قربان کر دیا! اُف کہ ہم نے بہشت کے جوانوں کے سردار کو بداطوار لوگوں کی خوشنودی کی خاطر اپنے ہاتھوں خون میں نہلایا۔ وہ اپنے کیے پر پشیمان تو ہوئے، لیکن اب وقت گزر چکا تھا۔

یوں کوفہ نے ایک دفعہ پھر شام کے سامنے اپنی عاجزی اور بیچارگی کا مظاہرہ کیا۔ یہی نہیں کہ وہ دمشق کو شکست نہ دے سکا بلکہ دوبارہ اس کے زیرِ تسلط آگیا اور اپنی سابقہ ذلّتوں میں ایک اور ذلّت کا اضافہ کر لیا۔

امام حسین علیہ السلام نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں ان لوگوں کو ان کے اس انجام کے بارے میں خبردار کیا اور فرمایا:

> "خدا کی قسم! اگر تم نے مجھے قتل کیا تو پھر تم ایک دوسرے کی جان کے لاگو ہو جاؤ گے اور ایک دوسرے کا خون بہاؤ گے۔ تاہم خدائے تعالیٰ تمہیں فقط اتنی سزا دینے پر اکتفا نہیں کرے گا بلکہ وہ تمہارے لیے بڑا سخت عذاب تیار کرے گا۔"

اس المناک حادثے کو رونما ہوئے اب تقریباً ساڑھے تیرہ سو سال گزر چکے ہیں۔ اس وقت سے لے کر اب تک —— کوفہ میں پے در پے کئی نسلیں پیدا ہوئی ہیں، لیکن جو نسل پہلی نسل کی جگہ لیتی ہے وہ ہر سال ان دنوں میں امام حسین علیہ السلام کے مزار کے گرد جمع ہوتی ہے، گویا کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کے کیے پر شرمسار ہو کر اس مزار پر آنسو بہاتی ہے اور امامؑ کی رُوح کے ساتھ دوستی اور اطاعت کا پیمان باندھتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے، اگر یہ ممکن ہو کہ تاریخ ماضی کی طرف پلٹ پڑے اور وہی نقشہ دوبارہ سامنے آجائے تو یہ شرمسار ہوتے والے کیا کریں گے اور کس دستے کا ساتھ دیں گے؟

پس اے پروردگار! اپنے بندوں کی کبھی بھی آزمائش نہ کر اور اگر آزمائش کرے تو انہیں ثابت قدم رہنے کی ہمت عطا فرما!

شہادتِ حسینؑ پر قاتلوں کی پشیمانی

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ

اور جس دن ظالم پشیمانی سے اپنے ہاتھ کاٹے گا۔

(سورۂ فرقان۔ آیت ۲۷)

جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ دمشق میں ایک جلد باز حکمران اپنی نئی حکومت کی بنیادیں مضبوط کرنا چاہتا تھا۔ اس نے جو کام حاکم مدینہ کے سپرد کیا تھا اگر وہ اسے پورا کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو معلوم نہیں کہ وہ ایک قابلِ علاج ردّ عمل سے دوچار ہوتا؟ اگر وہ ایسا کر گزرتا تو ممکن تھا کہ حجاز اور عراق چند سال کے لیے ایک طاقتور مخالف سے خالی ہو جاتے، لیکن ان کے اس منصوبے پر جس طرح وہ چاہتے تھے، عملدر آمد نہیں ہو سکا۔ وہ اپنے دہشت گردوں کی قوت سے مکہ میں بھی فائدہ نہ اٹھا سکے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مخالفت کا مرکز حجاز سے عراق منتقل ہو گیا۔ اس پر شام کو مجبوراً عسکری

مداخلت کرنی پڑی۔ اس لشکر کشی اور قتل و غارت سے دمشق کو بظاہر فتح نصیب ہوئی لیکن اس کامیابی نے اس کے لیے آئندہ شکست کا بیج بھی بو دیا۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں شکست کا آغاز جنگ کا طوفان تھمنے کے چند لمحوں بعد ہی فاتح کمانداروں کی پشیمانی سے ہو گیا۔ نیز ان بدعہد لوگوں کا ضمیر بھی چند لحظوں اور چند گھڑیوں کے لیے از سر نو بیدار ہو گیا۔ تاہم اتنا ہی کافی نہ تھا، بلکہ ضروری تھا کہ یہ لوگ اپنے شہر کو واپس جائیں اور دیکھیں کہ جن اشخاص نے ایک مہینہ پہلے ان کے ساتھ مل کر پیمان باندھا تھا اور فقط وعدہ خلافی پر اکتفا کیا اور اس پر مہمان کو قتل کرنے کی ذلت کا اضافہ نہیں کیا تھا، وہ ان قاتلوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں۔

چنانچہ شام کے وقت ایک شخص خوش خوش اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گھر میں داخل ہوتا ہے۔ تب اس کی بیوی پوچھتی ہے: "کیا بات ہوئی ہے کہ تم اتنے خوش نظر آرہے ہو؟"

وہ جواب دیتا ہے: "شاید تمہیں نہیں معلوم کہ میں تمہارے لیے دنیا کی دولت لایا ہوں، میرے پاس حسینؑ ابن علیؑ کا سر ہے۔"

وہ کہتی ہے: "وائے ہو تم پر، اور لوگ تو اپنے ساتھ سونا چاندی لائے ہیں اور تم پیغمبر اکرمؐ کے نواسے کا سر لائے ہو۔ خدا کی قسم ایسی آئندہ کبھی بھی اپنا سر تمہاری آغوش میں نہیں رکھوں گی۔"

ان بدعہدوں کی کربلا سے واپسی اور اپنے کنبہ سے ملاقات پر لازماً بیوی کی شوہر سے اور بیٹے کی باپ سے جدائی کے بہت سے واقعات ہوئے ہیں۔ لیکن تاریخ نے ان جزئیات کو تحریر نہیں کیا ہے۔ پھر جب کوفہ مکمل طور پر ہوش میں آگیا تو ان لوگوں نے دیکھا کہ انہوں نے امام حسینؑ

کے بیوی بچوں اور امام علیؑ و رسول اکرمؐ کی اولاد کو کافر قیدیوں کی طرح شہر میں لا کر کتنا بڑا کام کیا ہے۔

جب خلیفۂ رسولؐ اور مسلمانوں کے حاکم امام علیؑ اس شہر میں پانچ سال حکومت کرنے کے بعد قتل کردیے گئے" اس واقعہ کو ابھی بیس سال سے زیادہ مدت نہیں گزری تھی۔ اب جن عورتوں کی عمر تیس سال سے زیادہ ہو چکی تھی، انہوں نے اس زمانے میں بی بی زینب کو دیکھا تھا اور یہ بھی مشاہدہ کیا تھا کہ امام علیؑ ان بی بی کی کتنی عزت کرتے تھے اور ان عورتوں کے اپنے باپوں اور شوہروں کی نظر میں ان کا کتنا وقار تھا۔ انہی بی بی زینبؑ کے قید ہو کر آنے کا یہ منظر دیکھ کر پرانی یادیں تازہ ہوگئیں اور شہر کے کوچہ و بازار میں کہرام مچ گیا۔ عورتوں کو گریہ و ماتم کرتے دیکھ کر بچے بھی رونے لگے اور بچوں کے رونے پر بوڑھوں کے سخت دل بھی نرم ہوگئے۔ چنانچہ ہر طرف سے نالہ و فریاد کی آوازیں بلند ہوئیں۔ وہ واحد ہستی جو اپنی گفتگو سے اس جوش و خروش کو انتہائی بلندی پر پہنچا سکتی تھی، وہ امام علی علیہ السلام کی بیٹی تھی۔ کونسی بیٹی؟ زینبؑ یا ام کلثومؑ؟ مجھے اس بات کا علم نہیں لیکن امام حسین علیہ السلام کے بعد بی بی زینبؑ ہی عمر میں بڑی اور بزرگ ہونے کی بنا پر قیدیوں کے قافلے کی سرپرست کی حیثیت رکھتی تھیں۔

جو باتیں ہم لکھ رہے ہیں، بیشتر مقتل نویسوں اور شیعہ مورخین نے یہ انہی سے منسوب کی ہیں۔ تاہم سب سے پرانے مآخذ میں لکھا ہے کہ یہ باتیں بی بی ام کلثوم نے کہی تھیں۔ چنانچہ ابن ابی طاہر کہ جو اس حادثے کے ۱۴۰ سال بعد پیدا ہوا اور اس کے ۲۲۰ سال بعد فوت ہوا' اس نے اپنی ایک کتاب "بلاغات النساء" میں جو عرب اور اسلام کی خواتین کی بلیغ تقاریر کا مجموعہ ہے،

اس خطبے کو بی بی ام کلثوم ؑ کے نام منسوب کیا ہے۔ امام علی ؑ ابن الحسین ؑ جو نوجوان تھے اور ان دنوں بیمار اور کمزور تھے، جب انہوں نے کوفہ کے لوگوں کو روتے دھوتے دیکھا تو کہا: "اے لوگو! کیا تم ہمارے لیے رو رہے ہو؟ کیا ہمیں تمہارے علاوہ کسی اور نے قتل کیا ہے؟" اس وقت بی بی ام کلثوم ؑ نے ہاتھ کے اشارے سے لوگوں کو خاموش رہنے کو کہا۔ مؤلف مذکور لکھتا ہے کہ اس کے بعد اس مجمع میں سے فقط آہستہ آہستہ سانس لینے کی آواز سنی جا سکتی تھی، تب بی بی ام کلثوم نے فرمایا:

"اے کوفہ کے رہنے والو! اے مکار اور دھوکا باز لوگو! خدا کرے کہ تمہاری آنکھیں ہرگز آنسوؤں سے خالی نہ رہیں! خدا کرے تمہارے سینوں کی فریاد کبھی ختم نہ ہو! تم اس عورت کی مانند ہو جس نے اپنا سارا سوت کات لیا اور پھر جو کاتا تھا اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ نہ تمہارے وعدے کی کوئی قیمت ہے اور نہ تمہاری قسم کا کوئی اعتبار! تمہارے پاس سوائے ڈینگیں مارنے، اپنی تعریف آپ کرنے اور کنیزوں کی طرح منہ کی خوشامد کرنے اور در پردہ دشمن سے سازباز کرنے کے اور کیا ہے؟ تم ایسی سبز اور تر و تازہ گھاس کی مانند ہو جو گوبر کے ڈھیر پر اُگی ہو۔ تم ایسی سفیدی کی طرح ہو جو ایک قبر پر پھیری گئی ہو۔ تم نے اس دنیا کے لیے کتنا بُرا توشہ تیار کیا ہے ___ خدا کا غضب اور دوزخ کا عذاب! تم روتے ہو؟ ہاں بخدا! روؤ کیونکہ تم رونے ہی کے لائق ہو! زیادہ روؤ اور کم ہنسو! تم کیوں نہ روؤ۔ جب تم

نے ایسی ذلت اپنے لیے خریدی ہے؟ یہ ایک ایسی ذلت ہے جو کسی پانی سے دھوئی نہیں جا سکے گی۔ پیغمبرؐ کے فرزند اور جوانان بہشت کے سردار کو قتل کرنے سے بڑھ کر کب ذلت ہو سکتی ہے؟ تم نے ایک ایسے شخص کو قتل کیا جو تمہارے راستے کا چراغ اور تمہارے برے دنوں میں تمہارا مددگار تھا۔ بہتر ہے تم مرجاؤ! تم اپنا سر شرمندگی سے جھکالو! تم نے یکایک اپنا ماضی برباد کر لیا اور آئندہ کے لیے کوئی چیز حاصل نہ کی۔ لازم ہے کہ آئندہ تم ذلت اور خواری کی زندگی بسر کرو کیونکہ تم نے اپنے لیے خدا کا غضب خرید لیا ہے۔ تم نے وہ کام کیا ہے کہ شاید آسمان زمین پر گر پڑے۔ اس میں شگاف ڈال دے اور پہاڑوں کو توڑ پھوڑ دے۔ کیا تم جانتے ہو کہ تم نے کس کا خون بہایا ہے؟ کیا تم جانتے ہو کہ یہ عورتیں اور لڑکیاں جنہیں تم بے پردہ کوچہ و بازار میں لے آئے ہو، کون ہیں؟ کیا تم جانتے ہو کہ تم نے پیغمبر خداؐ کا جگر پارہ پارہ کر دیا ہے؟ تم نے ایسا برا اور احمقانہ کام کیا ہے کہ جس کی برائی نے ساری دنیا کو پر کر دیا ہے۔ تم تعجب کرتے ہو کہ آسمان سے خون کے قطرے زمین پر ٹپک رہے ہیں لیکن جان لو کہ قیامت کے عذاب میں تمہاری زبوں حالی اس سے زیادہ ہو گی۔ اگر خدا نے تمہارے گناہ پر تمہیں اب نہیں پکڑا تو اطمینان سے مت بیٹھو۔ کیونکہ خدائے تعالیٰ ہر گناہ کی سزا فوراً نہیں دیتا۔ تاہم وہ مظلوموں کا خون بہانے

کی سزا دیے بغیر کبھی نہیں چھوڑتا اور وہ ہر چیز کا حساب رکھتا ہے۔" [1]

یہ جملے جو انتہے فصیح الفاظ کے ساتھ ایک جلے ہوئے دل سے نکل رہے تھے اور خدا پر ایمان کے متلاطم سمندر سے قوت حاصل کر رہے تھے، انہوں نے سب کو دگرگوں کر دیا۔ سننے والوں نے اپنے ہاتھوں سے چہروں کو ڈھانپ رکھا تھا اور افسوس کر رہے تھے۔ اس دردناک اور عبرت آمیز موقع پر بنی جعفی کے ایک فرد نے جس کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو چکی تھی، اس مضمون کا ایک شعر پڑھا:

"اس خاندان کے فرزند بہترین فرزند ہیں اور اس گھرانے کے فرزندوں کے دامن پر کبھی بھی شرم یا ذلت کا داغ نہیں لگا۔"

پھر قیدیوں کے اس قافلے کو ابن زیاد کے محل میں لایا گیا۔ وہ ایک ایسی بزم تھی جس میں جہاں تک ممکن تھا طاقت کے اظہار کے تمام ساز و سامان اکٹھے کر دیے گئے تھے اس لیے کہ ابن زیاد نے اپنے خیال کے مطابق مکمل فتح حاصل کر لی تھی۔ اس نے امام حسینؑ کو قتل کر دیا اور عورتوں اور لڑکیوں کو دست بستہ اپنے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ پس اب سارا معاملہ ختم ہو گیا اور اب

---

[1] کہا گیا ہے کہ امام علیؑ کی دونوں بیٹیوں کا نام ام کلثوم ہی تھا۔ ایک ام کلثوم کبریٰ اور دوسری ام کلثوم صغریٰ تھیں۔ لہٰذا یہ خطبہ ام کلثوم کبریٰ بی بی زینبؑ کا ہے اور ام کلثوم صغریٰ کا ایک مرثیہ بڑا مشہور ہے جو انہوں نے مدینہ واپسی کے وقت کہا تھا۔ (ناشر)

وہ غالب اور رسول اکرم ص مغلوب تھے!

اس نے کہا: "خدا کا شکر ہے کہ اس نے تمہیں رسوا کیا اور ظاہر کر دیا کہ تم لوگ جو کچھ کہتے تھے وہ جھوٹ تھا۔"

ایک ظالم کہ جس کا سرمایہ طاقت کے علاوہ کچھ نہ ہو اس کے لیے اس سے زیادہ پریشان کن اور دردناک چیز اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ اس کی قوت کو ناچیز سمجھا جائے اور اس کا مذاق اڑایا جائے۔

اس وقت امام علیؑ کی بیٹی نے بولنا شروع کیا تو یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے اب تک کچھ بھی نہیں ہوا۔ نہ ان کا کوئی عزیز مارا گیا ہے نہ خود انہیں قیدی بنایا گیا ہے اور نہ ہی یہ شخص جسے وہ جواب دینے لگی ہیں، اپنے ایک اشارے سے انہیں اور ان کے ہمراہیوں کو ختم کر سکتا ہے۔

کربلا کی شیر دل خاتون نے کہا:

"شکر کا سزاوار وہ خدا ہے جس نے ہمیں رسول اللہ ص کے ذریعے عزت بخشی۔ فاسق کے علاوہ کوئی جھوٹ نہیں بولتا اور بدکار کے علاوہ کوئی رسوا نہیں ہوتا اور وہ ہم نہیں اور لوگ ہیں۔"

ابن زیاد جوان بی بی کی گردن خم کرنا چاہتا تھا۔ کچھ اور اکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اب اس نے چاہا کہ انہیں ایک ایسی شکست دے کہ جس کو وہ بی بی محسوس کریں۔ چنانچہ اس نے کہا: "تم نے دیکھا کہ خدا نے تمہارے بھائی کے ساتھ کیا کیا؟"

انہوں نے جواب دیا: "ہم نے خدا سے بھلائی کے علاوہ کچھ نہیں دیکھا، میرا بھائی اور اس کے ساتھی اس راستے پر چلے جو خدا کو پسند تھا۔ انہوں

نے قابل فخر شہادت کا انتخاب کیا اور خدا سے یہ نعمت پائی۔ لیکن اے ابن زیاد! تم نے جو کچھ کیا ہے اب اس کا جواب دینے کے لیے تیار ہو جاؤ!

اس گفتگو سے بھی ابن زیاد اپنا مقصد حاصل نہ کر سکا اور اس نے اپنے آپ کو شکست خوردہ محسوس کیا۔

اس کے بعد ایک نادان کا آخری ہتھیار کیا ہے؟ توہین کرنا۔ ابن زیاد نے کہا: "تمہارے سرکش اور نافرمان بھائی کے قتل ہونے سے خدا نے میرے دل کو شفا بخشی ہے۔"

امام علیؑ کی بیٹی نے جواب میں کہا: "اے ابن زیاد! تو نے ہمارے بزرگ کو قتل کر دیا۔ ہمارے نوجوانوں کا خاتمہ کر دیا اور ہمارے دلوں کو زخمی کر دیا ہے۔ اگر تیرے دل کی شفا یہی ہے تو یونہی سہی۔"

ابن زیاد کہنے لگا: "زینبؑ سجع میں باتیں کرتی ہے، میں اپنی جان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس کا باپ بھی سجع میں باتیں کرتا تھا۔"

بنتِ علیؑ نے جواب دیا: "اے ابن زیاد! ہمیں سجع سے کیا کام اور میرے لیے سجع کہنے کا یہ کونسا موقع ہے؟"

شہادت حسینؑ پر یزید کی پشیمانی

يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِي لَمْ أَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيلًا

وائے ہو مجھ پر کاش میں فلاں شخص کو اپنا دوست نہ بناتا۔ (سورۂ فرقان۔ آیت ۲۸)

دمشق کے لوگوں میں سے کسی نے نہ تو رسول اکرمؐ کو دیکھا، نہ ان کے ارشادات سنے اور نہ ہی وہ اسلام کو اس شکل میں جانتے تھے جس میں وہ مدینہ میں رائج تھا۔ رسول اکرمؐ کے صحابہ میں سے ایک سو تیرہ افراد نے یا تو اس سرزمین کی فتح میں حصہ لیا تھا یا بتدریج وہاں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان اشخاص کے احوال زندگی پڑھنے سے پتا چلتا ہے کہ ان میں سے چند ایک کو چھوڑ کر باقی بہت کم مدت کے لیے آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر رہے اور انہوں نے ایک دو یا چند احادیث سے زیادہ روایت نہیں کیں۔ ان میں سے بیشتر عمر بن خطاب اور عثمان بن عفان کی خلافت سے معاویہ کی

حکومت کے ابتدائی دور تک فوت ہو گئے۔ چنانچہ سانحۂ کربلا کے وقت ان میں سے فقط گیارہ افراد زندہ تھے اور وہ شام میں رہ رہے تھے۔ اس وقت ان کی عمریں ستر اور اسی سال کے درمیان تھیں اور انہوں نے لوگوں کے ساتھ میل جول رکھنے پر گوشہ نشینی کو ترجیح دے رکھی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نوجوان نسل یعنی جو لوگ یزید کی عمر کے تھے، وہ حقیقی اسلام سے بالکل بے بہرہ تھے اور شاید ان کے نزدیک اسلام بھی ان لوگوں کی حکومت کی طرح ایک حکومت تھی جو اس ٹولے سے پہلے اس سرزمین پر راج کرتے تھے۔ معاویہ کے دربار کی شان و شوکت۔ بیت المال کا ضیاع، ظاہری نمود و نمائش کی جانب توجہ، مثلاً عالیشان محلوں کی تعمیر۔ ذاتی محافظوں اور خدم و حشم کی تشکیل۔ مخالفین کو جلاوطن۔ قید یا قتل کر ڈالنا، ان کے لیے عام سی چیزیں تھیں کیونکہ نصف صدی پہلے تک سابقہ حکومت میں بھی یہی نظام دیکھنے میں آتا تھا۔ پس یہ مانی ہوئی بات ہے کہ ایسے لوگ بھی تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ مدینہ میں بھی یہی کچھ ہوتا رہا ہے۔

جن لوگوں نے عمر بن خطاب کی دمشق میں آمد دیکھی تھی ان میں سے چند ایک کے سوا کوئی زندہ نہ تھا۔ اس لیے شام کے لوگوں کو یہ تک معلوم نہ تھا کہ رسول اکرمؐ کے اہلبیتؑ کون لوگ ہیں۔ ہم نے دمشق کے سلسلے میں جو داستان لکھی ہے اور کہا ہے کہ یہ تاریخی حقیقت سے زیادہ ایک لطیفے سے ملتی جلتی ہے، وہ چنداں بعید معلوم نہیں ہوتی۔ لہٰذا اگر مقتل نویسوں نے لکھا ہے کہ شام کے لوگوں نے اہلبیتؑ کے وہاں پہنچنے کے دن کو عید قرار دیا اور ان کے مردوں کے مارے جانے پر جشن منایا تو یہ بات حقیقت سے کچھ دور نہیں ہے۔

جب یہ قافلہ محل میں پہنچا تو یزید کو ایسے ہی لوگ گھیرے ہوئے تھے، جو اسلام کو بھی ایک ملوکانہ حکومت سمجھتے تھے اور اس کے احکام سے بے خبر تھے۔ مجھے یہ علم نہیں کہ جو ماتمی اشعار یزید سے منسوب کیے گئے ہیں وہ واقعی اسی کے ہیں یا نہیں؟ لیکن سابق الذکر مؤلف ابن ابی طاہر نے یہ تین اشعار یزید کے کلام میں لکھے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یزید امام حسینؑ کے دندان مبارک پر چھڑی مارتا ہوا یہ کہہ رہا تھا:

کاش میرے بزرگ جو بدر میں پہنچے اور جنہوں نے وہاں قبیلہ خزرج کے تیروں سے نقصان اٹھایا، وہ اس مجلس میں موجود ہوتے اور خوشی مناتے ہوئے کہتے: اے یزید! تیرے ہاتھ شل نہ ہوں، تم نے علیؑ کی اولاد کے ساتھ بدر کے دن کا بدلہ چکا دیا ہے اور اپنا انتقام ان سے لے لیا ہے۔

ان اشعار میں پیغمبرؐ، دین اور قرآن کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ جو چیز ہم ان میں دیکھتے ہیں وہ جاہلیت کے مقتولوں کی یاد ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ ہم نے اس خون کو اہلبیتؑ کے خون سے دھویا ہے۔

اگر وہ بزم یہیں ختم ہو جاتی تو جیت یزید کی ہوتی اور جو کچھ اس کے حکم سے انجام پایا وہ چنداں برا معلوم نہ ہوتا۔ لیکن بی بی زینبؑ نے اس بات کی اجازت نہ دی کہ معاملہ اس شکل میں ختم ہو جائے۔ جس چیز کو یزید خوشی سمجھ رہا تھا اس کو انہوں نے اس کے حلق میں زہر سے بھی زیادہ تلخ بنا دیا۔ انہوں نے حاضرین پر واضح کر دیا کہ یہ خواتین جو تمہارے سامنے کھڑی ہیں، یہ اس پیغمبرؐ کی بیٹیاں ہیں جس کے نام پر یزید شام کے لوگوں

پر حکومت کر رہا ہے۔ انہوں نے ان لوگوں کو سمجھا دیا کہ اسلام قانونِ حکومت ہونے سے پہلے ایک دین ہے۔ پس حاکم سے لے کر ایک عام فرد تک ہر شخص جو کچھ کہتا اور کرتا ہے، اس کے لیے وہ خدائے تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہے۔ انہوں نے لوگوں کو یہ بھی بتا دیا کہ اسلام طاقت پر نہیں بلکہ تقویٰ کی بنیاد پر قائم ہے۔ پھر فرمایا:

"جن لوگوں نے بُرے کام کیے ان کا انجام یہ ہوا کہ انہوں نے خدا کی نشانیوں کو جھٹلایا اور ان کا ٹھٹھا اڑایا۔ اے یزید! کیا تو سمجھتا ہے کہ اب تو نے زمین اور آسمان کو ہم پر تنگ کر دیا اور ہمیں قیدیوں کی طرح ایک سے دوسرے شہر لیجایا گیا ہے، اس سے ہم ذلیل ہو گئے اور تو قابلِ عزت ہو گیا؟ کیا تو خیال کرتا ہے کہ یہ کام کر کے تیرا رتبہ بلند ہو گیا ہے کہ تو اپنے آپ پر ناز کرتا ہے اور ہر ایک کے ساتھ تکبر سے پیش آتا ہے؟ چونکہ تو دیکھتا ہے کہ تیری قوت کے اسباب مہیا ہو گئے ہیں اور تیری بادشاہت کا کاروبار منظم ہے اس لیے تو خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔ کیا تو نہیں جانتا کہ یہ مہلت جو تجھے دی گئی ہے اس لیے ہے تاکہ تو اپنی فطرت کو اس کی اصلی شکل میں ظاہر کرے۔ کیا تو خدائے تعالیٰ کا یہ ارشاد بھول گیا ہے کہ:

"کافر یہ نہ سمجھیں کہ ہم نے جو مہلت انہیں دی ہے وہ ان کے لیے اچھی ہے۔ ہم انہیں مہلت دیتے ہیں تاکہ وہ اپنے گناہوں کا بوجھ بھاری کر لیں۔ پھر انہیں ایسے عذاب میں مبتلا کیا

جائے گا جو سراسر ذلت اور رسوائی ہے۔"

اے آزاد کیے[1] گئے کے بیٹے! کیا یہ انصاف ہے کہ تیری عورتیں، لڑکیاں اور کنیزیں تو عزت کے ساتھ پردے کے پیچھے بیٹھیں اور تو پیغمبرؐ کی بیٹیوں کو قیدی بنائے، ان کی حرمت کا خیال نہ کرے، ان کی آواز گلے میں دبا دے اور غیر مرد انہیں اونٹوں پر بٹھا کر ایک سے دوسرے شہر گھماتے پھریں۔ نہ کوئی انہیں پناہ دے، نہ ان کی حالت کا احساس کرے، نہ ان کی دلجوئی کرے اور لوگ ہر طرف سے انہیں دیکھنے کے لیے جمع ہو جائیں لیکن ایک ایسے شخص سے جس کا سینہ ہمارے خلاف بغض سے بھرا ہوا ہو اس سے اس کے علاوہ کیا توقع ہو سکتی ہے؟ تو کہتا ہے کہ کاش میرے اجداد جو جنگ بدر میں مارے گئے یہاں موجود ہوتے اور یہ کہتے ہوئے تو پیغمبرؐ کے بیٹے کے دانتوں پر چھڑی مارتا ہے۔ تجھے ہرگز یہ خیال نہیں آتا کہ تو نے گناہ کیا ہے اور ایک بہت ہی ناروا کام کا مرتکب ہوا ہے۔ تو ایسا کیوں نہ کرے؟ تو نے رسول اکرمؐ کی اولاد اور عبدالمطلب کے گھرانے والوں کا خون بہا کر جو کہ زمین کے ستارے تھے، دو خاندانوں

---

[1] جب رسول اکرمؐ نے مکہ فتح کیا تو قریش کے سردار جو اپنے سابقہ اعمال پر پشیمان تھے، وہ ڈر رہے تھے کہ آنحضرتؐ انہیں سزا دیں گے لیکن آپ نے انہیں مخاطب کر کے فرمایا: "جاؤ تم آزاد کر دیے گئے ہو۔"

کے درمیان دشمنی کی تجدید کر دی ہے۔ خوش مت ہو کیونکہ جلد ہی تو خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہو گا۔ وہ وقت ہو گا جب تو آرزو کرے گا کہ کاش تو اندھا ہوتا اور یہ دن نہ دیکھتا۔ کاش تو یہ نہ کہتا کہ اگر میرے اجداد اس بزم میں موجود ہوتے تو خوشی سے پھولے نہ سماتے۔

اے خدا! تو خود ہمارا حق حاصل کر اور جن لوگوں نے ہم پر ظلم کیا ہے ان سے ہمارا انتقام لے۔ بخدا کہ تو نے اپنا پیٹ چاک کیا ہے اور اپنا ہی گوشت کاٹا ہے۔ جس دن رسول اکرمؐ ان کے اہلبیتؑ اور ان کے جگر کے ٹکڑے خدا کی رحمت کے سائے میں آرام کر رہے ہوں گے۔ اس دن تو بے حد ذلیل ہو کر اس کے سامنے کھڑا ہو گا۔ وہ دن ہو گا جس دن خدا اپنا وعدہ پورا کرے گا اور ان مظلوموں کو اکٹھا کرے گا جو اپنے خون میں لتھڑے ہوئے اِدھر اُدھر محوِ خواب ہیں۔

وہ خود فرماتا ہے:

"یہ خیال مت کرو کہ جو خدا کی راہ میں مارے گئے مردہ ہیں نہیں ایسا نہیں ہے، وہ زندہ ہیں اور اپنے پرودگار کی نعمتوں سے بہرہ مند ہیں"!

لیکن جس دن محمد رسول اللہؐ مدعی ہوں گے، خدا منصف ہو گا اور تیرے ہاتھ پاؤں اس مقدمے میں گواہ ہوں گے، اس دن تیرے باپ معاویہ کو جس نے تجھے ناحق مسلمانوں کی گردنوں پر مسلط کر دیا، یہ پتا چل جائے گا کہ تم دونوں میں

سے کون زیادہ بد بخت اور بے سہارا ہے!

اے خدا کے دشمن یزید! خدا کی قسم تو میری نظر میں اتنی قیمت نہیں رکھتا کہ میں تجھے سرزنش کروں یا تیری تحقیر کروں لیکن میں کیا کروں کہ میری آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں اور آہ سینے میں شعلہ زن ہے۔ جب حسینؑ قتل ہو چکے ہیں اور شیطان کے لشکری ہمیں کوفہ سے شام میں نادانوں کے سامنے لے آئے ہیں تاکہ خاندان رسولؐ کی حرمت کو پامال کرنے کا صلہ مسلمانوں کے بیت المال سے لیں جو محنت کشوں اور کسانوں کی کمائی ہے۔ جب ان جلادوں کے ہاتھ ہمارے خون سے رنگے ہوتے ہیں۔ ان کے منہ ہمارے گوشت کے ٹکڑوں سے پُر ہیں اور جب وحشی بھیڑیے کربلا کے شہیدوں کے پاکیزہ بدنوں کے آس پاس اچھلتے کودتے پھرتے ہیں تو اب تجھے ڈانٹ ڈپٹ کرنے کا کیا فائدہ ہے؟ اگر تو اس خیال میں ہے کہ ہمیں قتل کر کے اور قیدی بنا کر تو نے کوئی نفع حاصل کر لیا ہے تو تجھے جلد ہی پتا چل جائے گا کہ جسے تو نفع سمجھتا تھا وہ نقصان کے علاوہ کچھ نہیں۔ پھر کل قیامت کے دن جو کچھ تو نے کیا ہے اس کے علاوہ تجھے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ اس وقت تو ابن زیاد کو اپنی مدد کے لیے بلائے گا اور وہ تجھ سے امداد کا طالب ہو گا۔ وہاں تو اور تیرے ساتھی خدا کی میزانِ عدل کے پاس اکٹھے ہوں گے۔ اس دن تجھے معلوم ہو گا کہ تیرے باپ معاویہ نے تیرے لیے سفر کا جو

بہترین توشہ تیار کیا، وہ یہ تھا کہ تو نے رسول اکرمؐ کے فرزندوں کو قتل کیا۔ خدا کی قسم! میں اس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتی اور اس کے علاوہ کسی کے پاس شکایت نہیں کرتی۔ تو بھی جو کرنا چاہے کرلے اور جو بھی چال تو چاہے آزمالے، تو ہمارے لیے جو عداوت دل میں رکھتا ہے ظاہر کردے۔

خدا کی قسم! یہ رسوائی کا دھبہ جو تیرے دامن پہ لگ گیا ہے ہرگز دور نہیں ہوگا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے جوانان بہشت کے سردار کا معاملہ خوش بختی کے ساتھ انجام کو پہنچایا اور بہشت ان کے لیے واجب کردیا۔ میں خدا سے دعا کرتی ہوں کہ وہ ان کا رتبہ بلند کرے اور ان پر اپنی رحمت میں اضافہ کرے کیونکہ وہ ہر چیز پہ قدرت رکھتا ہے۔

یہ خطبہ جس میں ایک جلے ہوئے جگر اور تقویٰ سے سرشار دل کی قوت نمایاں تھی، اس کا ردعمل جو ہونا تھا وہ ظاہر ہے کہ ایک سخت دل رکھنے والا شخص بھی جب ایمان اور تقویٰ کا سامنا کرتا ہے تو وہ اپنی کمزوری اور اپنے حریف کی طاقت کو دیکھ لیتا ہے اور اس بارے میں چند لمحوں تک کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا۔ چنانچہ ان گھڑیوں میں سارے محل پر موت کا سناٹا چھایا رہا تھا۔ جب یزید نے حاضرین کے چہروں پر ناگواری کے آثار دیکھے تو کہنے لگا: "خدا ابن مرجانہ کو ہلاک کرے کہ میں حسینؑ کو قتل کرنے پر راضی نہیں تھا۔ پھر اسے خیال آیا کہ ان قیدیوں کو اس حالت میں رکھنا قرین مصلحت نہیں ہے۔ لہٰذا اس نے حکم دیا کہ ان کے لیے ایک بہتر جگہ

فراہم کی جائے اور اگر قریش کی عورتیں ان کے پاس جانا چاہیں تو کوئی ممانعت نہیں ہے۔

ان ایام میں وہ امام علیؑ ابن الحسینؑ کو دوپہر اور شام اپنے دسترخوان پر دعوت دیتا اور ان سے مل کر کھانا کھاتا تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا واقعی اس کے دل میں کچھ پشیمانی پیدا ہو گئی تھی؟ جب ہم ان صحرانشین لوگوں کی دورخی فطرت کا تجزیہ کرتے ہیں تو اس احتمال کی گنجائش نکل سکتی ہے لیکن اس سے پیشتر کہ یہ احتمال اپنے لیے جگہ نکالے ایک اور یقین اسے رد کر دیتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر یزید ایسا نہ کرتا تو ممکن تھا کہ کوفہ جیسی شورش دمشق میں بھی پیدا ہو جاتی۔ گو اسے فوری طور پر دبایا بھی جا سکتا تھا۔ بہر حال اس دن اور اس بزم میں بی بی زینبؑ کے اعلان حق سے شام کے لوگوں میں سے ایک گروہ کو پتا چل گیا کہ اسلام وہ نہیں ہے جو وہ آج تک دیکھتے رہے اور مسلمان حاکم وہ شخص نہیں ہے جو ان پر حکومت کر رہا ہے۔

قاتلانِ حسینؑ کا انجام

یَوْمُ الْمَظْلُوْمِ عَلَی الظَّالِمِ اَشَدُّ مِنْ یَوْمِ الظَّالِمِ عَلَی الْمَظْلُوْمِ

جس دن مظلوم اپنا حق حاصل کرے گا وہ زیادہ سخت ہے اس دن سے جس دن ظالم نے مظلوم پر ظلم ڈھایا۔

(حضرت علیؑ علیہ السلام)

وقت مجرم ہے لیکن جرائم پیشہ نہیں ہے اور تاریخ کی مانند ہر قسم کی یادوں کو محفوظ رکھتا ہے۔ تاہم بہت کم ایسے جرائم ہیں جنہیں وہ بدلہ لیے بغیر چھوڑتا ہے۔ اگر تاریخ کے جرائم کا حساب نہ بھی رکھا گیا ہو تو بھی قانون مکافات یعنی ہر جرم کی فطری سزا کا عمل اس کا حساب رکھتا ہے اور وہ حساب نہایت دقیق ہوتا ہے۔

قرآن مجید فرماتا ہے: " کافر یہ نہ سمجھیں کہ اگر ہم انہیں مہلت دیتے ہیں تو اس میں ان کا فائدہ ہے۔ ہم انہیں مہلت دیتے ہیں تاکہ وہ

جو کرنا چاہیں کر لیں اور آخر کار انہیں دردناک عذاب دیا جائے گا۔"

ایسے ہی تھے وہ لوگ جنہوں نے امام حسین علیہ السلام کو اپنے پاس بلایا اور ان سے حمایت کا وعدہ کیا اور ان کے نمائندے کا بڑے جوش و خروش سے استقبال کیا اور اس کی بیعت بھی کی لیکن جب عمل کا وقت آیا تو اس نمائندے کا ساتھ چھوڑ کر ایک ایک کر کے چل کھڑے ہوتے اور اپنے گھروں کے دروازے بند کر لیے۔ پھر امامؑ کا وہ نمائندہ تن تنہا رہ گیا اور ابن زیاد نے اسے مار ڈالا۔ بعد میں امام حسینؑ وہاں آئے تو وہ ان کے دشمن سے مل گئے اور اسے خوش کرنے کے لیے امامؑ کو قتل کر دیا۔ اسی طرح ان میں سے کچھ لوگ ایک بلند مقام پر پہنچ کر ان کی مظلومیت پر روتے رہے اور خدا سے دعا مانگتے رہے کہ وہ ان کی مدد کرے! جب وہ سارا معاملہ ختم ہو گیا تو ان کے دل کو سکون حاصل ہو گیا اور وہ اپنے آپ سے کہنے لگے کہ:

"رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت"

دمشق کی حکومت اور کوفہ میں اس کے گماشتے نے بھی یہی سمجھا کہ وہ فتحیاب ہو گئے ہیں۔ کیونکہ جب حسینؑ نہیں رہے تو کسی دوسرے کو ان کی مخالفت کی کیا مجال ہے؟ تاہم ان دونوں گروہوں نے ایک چیز کا خیال نہیں کیا تھا اور وہ تھی "جیسی کرنی ویسی بھرنی"، یعنی فطرت کے قانون میں کوئی عمل اپنے ردعمل کے بغیر نہیں رہتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ردعمل فوراً ظاہر ہو جائے یا اس میں دسیوں سال لگ جائیں، لیکن بالآخر وہ ظاہر ہو کر ہی رہتا ہے کیونکہ یہ تخلیق کا دستور ہے اور یہ خدا کا قانون ہے جو کبھی نہیں بدلتا، پس یہ لازم ہے کہ ظالم کو اس کے کیے کی سزا ملے اور یہ لازم ہے کہ مظلوم کے خون کا بدلہ لیا جائے۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کربلا کے ردعمل کا پہلا مرحلہ یزیدیوں کی پشیمانی تھی۔ وہ پشیمانی کہ جو فوج کے افسروں اور سپاہیوں نے محسوس کی، وہ پشیمانی جو کوفہ کے حکومتی مرکز اور سلطنتِ دمشق کو لاحق ہوئی تھی۔

زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ ابن زیاد نے عمر وسعد کو طلب کیا اور کہا: "وہ تحریر کیا ہوئی جو میں نے حسینؑ کو قتل کرنے کے بارے میں تمہیں دی تھی؟ وہ مجھے دے دو۔"

عمرو نے جواب دیا: "میں وہ تحریر کب تک اپنے پاس رکھتا" وہ میں نے گم کر دی ہے۔"

ابن زیاد نے کہا: "کیا تم اسے قریش کی بوڑھی عورتوں کے سامنے اپنے لیے بہانہ بنانا چاہتے ہو؟"

ادھر یزید نے کہا: "مجھے یہ منظور تھا کہ میرا ایک بیٹا مارا جاتا لیکن حسینؑ قتل نہ ہوتے۔ خدا ابن مرجانہ کو ہلاک کرے اس نے ایسا کام کیوں کیا؟"

بلاشبہ یزید یہ جھوٹ کہہ رہا تھا — لیکن وہ ڈرتا تھا — وہ ردعمل سے ڈرتا تھا۔ کیونکہ اس نے اپنے قول وفعل کے خلاف ردعمل تو پہلے ہی دن اپنے قصر شاہی میں دیکھ لیا تھا۔ ابھی ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ جب مدینہ کے نمائندے اس کے ہاں سے لوٹے تو انہوں نے لوگوں کو بتایا: یزید کے پاس دولت اور حکومت تو ہے لیکن اس کی ذات میں مسلمان ہونے کی کوئی نشانی نہیں ہے۔ اس پر پورے مدینہ میں اضطراب پھیل گیا اور لوگوں نے یزید کے خلاف بغاوت کر دی۔ انہوں نے پہلے امویوں کو شہر سے نکال باہر کیا اور پھر انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا لیکن آخرکار

حکومت شام نے بڑی مستعدی سے کارروائی کی اور مدینہ کا محاصرہ کرکے اسے فتح کر لیا۔ تب رسول اکرمؐ کے شہر میں قتل عام کیا گیا اور مدینہ کے بہت سے لوگ مارے گئے۔ دوسری جانب مکہ میں عبداللہ بن زبیر اٹھ کھڑا ہوا۔ جس نے اپنی طاقت کافی بڑھا لی تھی اور یزید کو اپنی عمر کے آخری سال میں اس پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ ۶۴ھ میں یزید مر گیا اور اس کے ساتھ ہی کوفہ انتقام کی آگ میں جلنے لگا۔ وہاں کے سرکردہ شیعہ افراد نے پہلے تو یہ سوچا کہ اپنے گناہوں کو دھونے کے لیے بنی اسرائیل کی طرح تلواریں اٹھا لیں اور ایک دوسرے کو قتل کر دیں۔ لیکن پھر انھوں نے ایک زیادہ عاقلانہ فیصلہ کیا اور وہ یہ کہ انہیں ایک دوسرے کو قتل کرکے نہیں بلکہ اہل بیتؑ کے دشمنوں کو قتل کرکے اپنا غصہ ٹھنڈا کرنا چاہیے۔ چنانچہ از سر نو قتل گاہ بلکہ بہت سی قتل گاہیں بن گئیں لیکن اس بار قتل ہونے والے خدا کے برگزیدہ بندے اور پاک نہاد لوگ نہ تھے بلکہ وہ جلاد تھے جن کے ہاتھ آزاد بندوں کے خون سے کہنیوں تک رنگے ہوئے تھے۔ آج کے زمانے میں جب ہم مختار بن ابی عبیدہ ثقفی کے قتل عام کی داستان پڑھتے ہیں تو اگر ہم حقوق کے بارے میں لکھی گئی کتابوں پر نظر ڈالیں تو ممکن ہے کہ ایسا انتقام ہمیں کسی حد تک سخت معلوم ہو اور ہم کہیں کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا۔ یعنی ایک کا سر بھیڑ کی طرح قلم کر دیا گیا اور کسی دوسرے کا پیٹ چاک کر ڈالا گیا۔ ایک اور شخص کو جس نے امام حسینؑ کے ایک فرزند پر تیر چلایا اور اس نے اپنے ہاتھ کو سپر بنایا تو اس کے ہاتھ اور پیشانی پر زخم آ گئے تھے۔ اس تیر انداز کو بھی ویسی ہی سزا دی۔ ایک اور کو ابلتے ہوئے تیل کی دیگ میں ڈال دیا۔ جبکہ ایک اور شخص کے ہاتھ اور پاؤں زمین میں

گاڑ کر اس پر گھوڑے دوڑا دیے۔ جیسا کہ مؤرخین نے لکھا ہے کہ صرف ایک مقام پر ۲۴۸ اشخاص کو اسی طرح کی سزائیں دی گئیں جو امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کے قتل میں شریک ہوئے تھے۔

جب ہم یہ واقعات پڑھتے ہیں تو ہمیں ان میں ایک قسم کی بے رحمی نظر آتی ہے لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اگلے لوگوں کے کردار کے بارے میں تیرہ سو سال بعد اس دنیا میں آنے والوں کا فیصلہ درست نہیں ہے۔ علاوہ ازیں جب انقلاب کا جذبہ جوش مارتا ہے تو معیار بدل جاتے ہیں۔ گویا انقلاب عموماً غصے اور بے رحمی کے ساتھ ہوتا ہے۔ بلکہ اگر انقلاب میں غصہ شامل نہ ہو تو وہ انقلاب نہیں ہوتا۔

شمر، ابن زیاد، عمرو بن سعد، اس کا بیٹا حفص، خولی، سنان اور کوفہ کے یزیدی لشکر کے وسیوں سرداروں نے یہ سزائیں بھگتیں لیکن تاریخ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ یعنی یہ پہلا انقلاب اور پہلا انتقام نہیں تھا، بلکہ ایک کے بعد ایک اور انقلاب آتا گیا۔ پھر مختار ثقفی، مصعب ابن زبیر کے ہاتھوں اور مصعب، عبدالملک بن مروان کے حکم سے قتل ہوا اور ان میں سے ہر ایک سالار کے ساتھ لوگوں کا ایک ایک گروہ بلکہ کئی ایک گروہ قتل ہوئے۔ حسینؑ ابن علیؑ کا سر ابن زیاد کے سامنے لایا گیا۔ ابن زیاد کا سر مختار ثقفی کے سامنے لایا گیا، مختار کا سر مصعب ابن زبیر کے سامنے لایا گیا اور مصعب کا سر عبدالملک بن مروان کے سامنے رکھا گیا اور یہ تمام واقعات دس سال سے کم مدت میں رونما ہوئے۔ ان دس سالوں میں جیسا کہ فرزند رسولؐ نے لوگوں کو خبردار کیا تھا، کوفہ نے سکھ کا سانس نہ لیا۔ ہر سال اور ہر مہینے کسی نہ کسی جانب سے ایک نیا فتنہ

اٹھ کھڑا ہوتا تھا۔ دوسری طرف خوارج نے سارے مشرقی اور جنوب مشرقی عراق کے لیے خطرہ کھڑا کیا ہوا تھا اور ان کی تاخت و تاز کا دائرہ خوزستان تک وسیع ہو گیا تھا۔ کوفہ اور بصرہ بلکہ سارے عراق میں امن مفقود ہو چکا تھا، چور، ڈاکو اور موقع پرست لوگ یکے بعد دیگرے اور ایک گروہ کے بعد دوسرے گروہ کی شکل میں ہر طرف سے امنڈ پڑے۔ نہ حاکم رعیت سے خوش تھا اور نہ ہی رعیت چین کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ یہ امام حسینؑ کا ایک اور ارشاد تھا جس کے مطابق وہ ظالم لوگ عذاب کی گرفت میں تھے۔ اس وقت تک امام حسینؑ کی شہادت کو چودہ سال گزر گئے تھے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس مدت میں کوفہ نے چودہ مہینے بلکہ چودہ ہفتے بھی سکھ کا سانس نہ لیا۔ آخر کار امام حسینؑ کے آخری فرمان نے عملی شکل اختیار کی اور پھر وہ آخری منظر بھی سامنے آ گیا۔ یہ واقعہ ۷۵ھ میں وقوع پذیر ہوا۔

ایک دن جب شہر کوفہ کے کچھ سربرآوردہ اشخاص مسجد میں بیٹھے تھے، ایک شخص اپنا سر اور چہرہ ڈھانپے ہوئے اندر داخل ہوا۔ اس نے تلوار اپنی کمر سے باندھ رکھی تھی اور ایک کمان کندھے پر لٹکا رکھی تھی وہ لوگوں کی جانب کوئی توجہ دیے بغیر صفیں چیرتا ہوا آگے بڑھا اور منبر تک جا پہنچا۔ پھر وہ منبر پر چڑھا اور سب سے اوپر کے زینے پر بیٹھ گیا اور خاموش رہا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ وہ ایک گھنٹے تک چپ بیٹھا رہا۔ شاید ہمیشہ کی طرح انہوں نے وقت کے بارے میں مبالغہ کیا ہے۔ تاہم اس کی خاموشی کی مدت خواہ کتنی بھی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ سرگوشیاں کرنے لگے۔ ایک نے پوچھا: "یہ کون ہے؟" دوسرے نے جواب دیا: "کیا تمہیں نہیں معلوم؟ یہ نیا حاکم ہے۔" پہلا بولا: "خدا بنی امیہ کا منہ سیاہ کرے جنہوں نے

ایسے آدمی کو عراق پر حکومت کرنے کے لیے بھیجا ہے، کیوں نہ میں اس پر پتھراؤ کروں؟"

دوسرے نے کہا: "نہ ۔۔۔ نہ بھائی! تجھے اس سے کیا کام؟ تھوڑی دیر صبر کرو، دیکھیں کہ کیا ہوتا ہے!"

جب ہر طرف خاموشی چھا گئی اور سب لوگوں کے سینوں میں سانس رک گئی تو اس شخص نے اپنے چہرے پر سے پردہ ہٹایا اور کہا:

"مجھے لوگ اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ میں کسی مشکل سے نہیں گھبراتا۔ جب عمل کا وقت آئے گا تو تم لوگ جان لوگے کہ میں کون ہوں۔

اے کوفہ والو! خدا کی قسم! میں جانتا ہوں کہ شر کا سامنا کس طرح کروں۔ میں آنکھوں کو پتھرایا ہوا اور گردنوں کو کھنچا ہوا دیکھتا ہوں۔ میں ایسے سروں کو دیکھتا ہوں جو پکے ہوئے پھل کی طرح شاخ پر بوجھ بنے ہوئے ہیں اور انہیں فوراً کاٹ لینا چاہیے۔ میں ایسے خون دیکھتا ہوں جنہوں نے پگڑی سے لے کر داڑھی تک کو رنگین کر دیا ہے اور ان کی سرخی دھوپ میں دمک رہی ہے۔

اے عراق کے لوگو! اے تفرقہ اور نفاق کی گھٹڑیوالے فاسد اخلاق والے گروہ! میں بید نہیں ہوں کہ ان ہواؤں سے کانپ جاؤں گا۔ میں تربوز نہیں ہوں کہ تم مجھ سے کھیلو اور مجھے اپنی انگلیوں کے درمیان دباؤ! میں اپنے ہوش، ذکاوت۔ فہم اور فراست کا امتحان دے چکا ہوں

اور اس میں بہت اچھی طرح کامیاب ہوا ہوں۔
امیر المومنین نے اپنا ترکش الٹ دیا اور تیروں کو ایک ایک کر کے اپنے دانتوں تلے دبا کر آزمایا۔ میں ان سب میں سے زیادہ سخت اور مضبوط تھا اور اس لیے انہوں نے مجھے تمہارے لیے چن لیا۔ کیونکہ سالہا سال سے تم سب نے مل کر فتنہ و فساد برپا کر رکھا ہے۔ گمراہی کو اپنا پیشہ بنا لیا ہے اور نافرمانی کا راستہ اختیار کیا ہوا ہے۔ خدا کی قسم! میں درخت کی چھال کی طرح تمہارے جسموں پر سے کھال اتار لوں گا اور چقماق کے پتھر کی طرح تمہارے سروں پر برسوں گا۔ اور دھار بن کر تمہاری تلواریں توڑ ڈالوں گا اور تمہیں ایسے اجنبی اونٹ کی طرح پیٹوں گا، جسے ہر طرف سے مار بھگایا جاتا ہے۔ تم اس شہر کے لوگوں کی طرح ہو جو امن اور چین سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ انہیں روزی فراغت سے ملتی تھی لیکن انہوں نے ناشکری کی اور خدا نے انہیں بھوک اور خوف کا لباس پہنا دیا۔ [1]
جب لوگوں نے یہ ذلت آمیز باتیں سنیں اور حقارت پر مبنی سلوک دیکھا۔ جب انہیں پتا چل گیا کہ ایک ایسا شخص ان پر مسلط کر دیا گیا ہے جو ان سے اسی زبان میں بات کرتا ہے جو وہ سمجھتے ہیں، جب انہوں نے گائے کے خریدار اسرائیلیوں کی طرح وہ تمام نشانیاں اس میں دیکھ لیں جو وہ جانتے

---

[1] سورۂ نحل۔ آیت ۱۱۲

تھے تو سبھی نے زبانِ حال سے کہا: "الان جئت بالحق"۔
مرحبا! تم نے کیا خوب کہا ہے۔ ہم تمہاری ہی جستجو میں تھے
اور تمہیں جیسے غیر معمولی شخص کا انتظار کر رہے تھے۔ ؎
"کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ توست"
جو شخص اس پر پتھراؤ کرنا چاہتا تھا" اس کے ہاتھ کانپنے لگے اور
سنگریزے اس کی مٹھی سے گرنے شروع ہو گئے۔
اس طرح حجاج بن یوسف کوفہ کا حاکم بن گیا۔ ایک دفعہ پھر عقائد
کی جانچ پڑتال کا محکمہ وجود میں آگیا اور جاسوسی، الزام تراشی، گرفتاری،
قید، شکنجے، قتل اور بالآخر گلا گھونٹ ڈالنے والی حکومت کا دور دورہ ہو گیا۔
یہ ہے ان گھٹیا لوگوں کی سزا جو خدا کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں۔
خدا سے روگردانی کرتے ہیں اور شیطان کو اپنا قبلہ بنا لیتے ہیں۔
ایک دفعہ پھر شام نے کوفہ کا منہ چڑا دیا!

ہماری مطبوعات

اسلام دینِ فطرت
اسلام دینِ معاشرت
اسلام دینِ معرفت
اسلام دینِ حکمت
فلسفۂ معجزہ
فلسفۂ شہادت
فلسفۂ ولایت
فلسفۂ [illegible]
فلسفۂ احکام
تاریخِ عاشوراء
گفتارِ عاشوراء
بنائے کربلا
مرگِ گُل رنگ
مکتبِ اسلام
مکتبِ رسولؐ
مکتبِ تشیّع
آخری فتح
انتظارِ امامؑ
توضیح المسائل اردو
توضیح المسائل فارسی
شریعت کے احکام

کتابُ الدعاء والزیارات
اعمالِ حج
حکایاتُ القرآن
حیاتِ انسان کے چھ مرحلے
مقالاتِ مطہری
بُت شکن
مَردِ انقلاب
ہار جیت
بہلول عاقل
فُزتُ بِرَبِّ الکَعبَۃِ
سخن
ابُوطالب۔ مظلومِ تاریخ
تفسیر سورۃ حمد
شرحِ قرآن
سِیر و سُلوک
یَسَّرنَا القرآن
غدیر کی برکتیں
تعلیماتِ اسلامی
حدیثِ کِساء
دُعائے کُمَیلؒ

نیز: بچّوں کے لیے دل چسپ مذہبی کہانیاں بھی دستیاب ہیں!

جامعہ تعلیماتِ اسلامی پاکستان